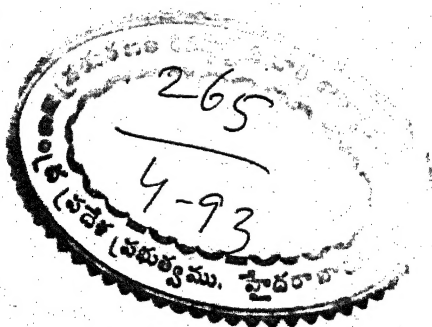


کنواں آدمی اور سمندر



عوض سید

مجموعہ حقوق بحق مصنف محفوظ

سنہ اشاعت: ستمبر ۱۹۹۳ء
پینٹل ایڈیشن: پانچ سو
سرورق: سعادت علی خاں
خوشنویسی: محمد عبد الماجد

طباعت: دائرہ پریس چھتہ بازار حیدرآباد
ناشر: مصنف
معاونت: اردو اکیڈمی آندھرا پردیش و ادبی ٹرسٹ حیدرآباد
قیمت: بیس روپے / 50 Rs

تقسیم کار:

- مکتبہ شعر و حکمت پنجہ گٹھ حیدرآباد
- حسامی بک ڈپو، پھلی کمان حیدرآباد
- موڈرن پبلشنگ ہاؤس - دریا گنج نئی دہلی ۱۱
- مکتبہ جامعہ لٹریچر دہلی - بمبئی - علی گڑھ
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی -
- ایجوکیشنل بک ہاؤس - مسلم یونیورسٹی مارکٹ علی گڑھ
- سیل کاؤنٹر - روزنامہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ حیدرآباد
- الکتا بک پبلشرز - گن فاؤنڈری - حیدرآباد -
- اسٹوڈنٹس بک ڈپو - چارمینار حیدرآباد
- مصنف 837/8-6-11 فرسٹ فلور - ریڈ ہلز - حیدرآباد - ۴

سراج محمود کے نام.....

عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں۔

فہرست

۵	۱: چند باتیں
۶	۲: چھلاوے
۱۱	۳: اندھا کنواں
۱۶	۴: تشلیٹ
۲۰	۵: اُداس نسل کا آخری آدمی
۲۲	۶: پھانس
۲۹	۷: پنجرہ
۳۳	۸: جوتک
۳۷	۹: ہیں خواب ہیں ہنوز
۴۱	۱۰: چوتھا آدمی
۴۳	۱۱: دُعا
۵۳	۱۲: مردہ گاڑی
۵۸	۱۳: ایک زہریلی کہانی
۶۲	۱۴: استری
۶۷	۱۵: گریباں گیر
۷۲	۱۶: گریہ
۷۸	۱۷: ریت کے محل
۸۸	۱۸: شال
۹۳	۱۹: کتبہ
۹۷	۲۰: تفسیر اٹکٹ
۱۰۲	۲۱: دو گز زمین
۱۰۶	۲۲: کنواں آدمی اور سمندر

چند باتیں

افسانے کا سفر پرانی داستانوں سے شروع ہوا تھا۔ آج وہ اُس جگہ پر آپہنچا ہے جہاں اس میں اور شاعری میں فرق کم رہ گیا ہے۔

میرا خیال ہے افسانہ ابھی شاعری کے زینے تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ اس میں افسانے کی برائی یا مسبکی کی تلاش فضول ہے۔ لیکن افسانے کا یہ طویل اور لمبا سفر کب تک جاری رہے گا یہ کوئی نہیں بتا سکتا مجھے تو کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ میرا سفر بھی ایک انجانا سفر ہے۔ میں مدتوں سیدھے خطوط پر چلتا چلتا اب کھیلے چند برسوں سے غیر محسوس طور پر غیر متوازی خطوط پر چل پڑا ہوں۔

میں جب کبھی کسی تجربے کو گلے لگاتا ہوں تو وہ مجھے ڈستا ہے، کبھی کبھی وہ میرے وجود سے چٹ کر میری اپنی شخصیت کا مجذب بن جاتا ہے۔ افسانہ اور اس کے اجزاء ترکیبی ہمیشہ میرے لیے ایک معتمد بنے رہے۔ ممکن ہے اس کا عمل بعض نقادوں کے پاس ہو تو میرے پاس نہیں۔

وہ کردار جس نے سعادت حسن منٹو سے اچھی کہانیاں لکھوائیں اب ہم میں نہیں رہا۔ اور اب خود شناسی کے ساتھ ساتھ اپنی ذات کی بازیافت کا مسئلہ بھی آکھڑا ہو تو لازماً میں کردار سے آنکھ ملا کر بات کرنے کا بھی اہل نہیں رہا۔ افسانے کے منظر نامے میں کہیں میرا نام ابھرتا بھی ہے یا نہیں مجھے اس کی کوئی خاص فکر نہیں ہے۔ ویسے ہندوپاک کے کئی باشعور ادیبوں اور نقادوں نے میری بیشتر کہانیوں کو سراہا ضرور ہے۔ شاید اسی حوصلہ افزائی کے سبب اب تک میری کہانیوں کے پانچ مجموعے چھپ چکے ہیں۔

”کنواں آدنی اور سمندر“ میرے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ہے، جو آپ کی نذر ہے۔ ممکن ہو تو اسے پڑھیے اور اپنی گراں مایہ رائے مجھے لکھ بھیجئے۔

بچھلاؤ

پوسٹ مین کی مانوس آواز پر وہ اچانک اٹھ کر دروازے تک پہنچا اور ایک ثانیے کے لیے خط کی پیشانی پر لکھے ہوئے پتے پر نگاہ ڈالی۔ پتہ صحیح تھا مگر نام کچھ اور تھا۔ قبل اس کے کہ پوسٹ مین کو آواز دینا وہ خط پھینک کر سیڑھیاں پھلانا لگتا ہوا نیچے جا چکا تھا۔

شام کو جب وہ باہر نکلا تو اُس نے اس خط کو احتیاط سے جیب میں رکھا اور چوراپے پر کھڑے ہلکے پوسٹ بکس کے منہ میں اُسے بڑی بے دردی کے ساتھ پھینک دیا۔

اب وہ جانے کیوں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ اُس نے خواہ مخواہ جلد بازی سے کام لیا۔ ہو سکتا ہے پھینکا ہوا وہ خط اُسی کا ہو۔ پتہ تو اُسی کا تھا۔ نام میں بھلا کیا دھڑ ہے۔ نہیں نہیں۔ نام ہی شناخت کا زینہ ہے۔ اگر وہ اسے بھی کھودے تو باقی صرف اس کا چہرہ ہی رہ جاتا ہے۔ مگر شناخت تو چہرے ہی سے ہوتی ہے نام تو اس کے پیچھے ہاتھ باندھے چلتا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا اور بے ارادہ تارکول کمی ٹری سڑک پر تیز تیز چلنے لگا۔

ارے فہم۔ کیا اور گی، ہجوم میں سے کسی نے آواز لگائی۔ آواز کے دوش پر اڑتا ہوا جب وہ اس کے قریب پہنچا تو وہاں دو اجنبی آپس میں گلے مل رہے تھے جیسے برسوں بعد وہ ایک دوسرے سے ملے ہوں۔ یہ منظر اُسے بڑا پیارا لگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے خود آگے بڑھ کر اس اجنبی کو گلے لگایا ہو۔ وہ بھی تو فہم ہی ہے مگر اُس کا چہرہ.....

اب وہ کھویا کھویا سا راستہ طے کرنے لگا۔ وہ منظر جو تھوڑی دیر پہلے اُس نے دیکھا تھا اب وہ اپنی وراسی جھلک دکھا کر غائب ہو چکا تھا۔ اب اس کی جگہ دو آدمی آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ دونوں کے جسم سے خون کی سرخ سرخ بوندیں ٹپک رہی تھیں مگر لوگوں کے مشاغل

میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ اپنا بھائی مرد ہا ہے اورے کوئی اُسے بچاؤ۔“ مگر وہاں بچانے والا کوئی نہ تھا۔

ایسے تماشے اس نے بہت دیکھے تھے، ایک طرح سے وہ خود ایک بہت بڑا تماشہ بین تھا۔ پھر لوگ ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ موت کے کنویں میں چھلانگ لگا رہے تھے اپنی چوں سالہ زندگی میں اس نے اپنے کئی عزیزوں یا رول کو قبر کے منہ میں پھینک آنے کی ادیت دہ دم ادا کی تھی۔ اس سے بڑا ظلم اس کے ساتھ اور کیا ہو سکتا تھا۔ اور تو اور مرنے والوں کی ایک لمبی فہرست اُس نے اپنے پاس رکھ چھوڑی تھی۔ جسے وہ ہر برس یوں دیکھتا جیسے وہ اپنی عمر کا حساب لگا رہا ہو۔ اکثر دفعہ تو اس نے چپکے سے اپنے نام کا اضافہ کر دیا تھا لیکن جب فہرست پر اس کی نگاہ جاتی تو ناموں کی جھرمٹ میں اس کا اپنا نام کہیں معدوم ہو کر رہ جاتا۔ تلاش بسیار کے باوجود جب اُسے فہرست میں اپنا نام دکھائی نہ دیتا تو وہ چپکے چپکے سسکیاں بھرنے لگتا۔ آخر وہ کب تک زندگی کی اس بے ہنگم سیڑھی سے چمٹا رہے گا۔ آخر کب تک؟ پھر ایک بار اُسے لگا جیسے سامنے کے پیڑھے پیڑھے قبرستان میں لوگ کسی اور آدمی کی بجائے اُسے دفن کر لوٹ رہے ہوں۔ اُن کے چہروں پر یہیں بھی اُداسی کی لکیریں نہیں تھیں۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا اُس کی موت کسی کے لیے بھی اُداسی کا سبب نہ بنے مگر یہ خواب اچانک ٹوٹ پھوٹ کر سانچے کے دروں کی طرح سڑک پر پھھر کر رہ گیا۔

اب اس کے سامنے اُس کی اپنی بیوی کھڑی تھی۔

”دیکھا تم بھی ان ہی لوگوں میں سے تھیں۔“

”وہ آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں۔“

”وہ اُن ہی لوگوں کی جو ابھی ابھی.....“

”وہ چلے یہ نالٹک بہت ہوا۔ گھر پر کچھ مہمان آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

بھری سڑک پر اس کی بیوی نے جب اس کا ہاتھ تھامتا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ گھر پر کچھ لوگ واقعی اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے چہرے بھی کچھ عجیب سے تھے۔

جیسے وہ کسی انجانی دنیا کے باشندے ہوں۔

اُسے ڈرائیونگ روم میں آتے دیکھ کر سب احزانہ اٹھ کھڑے ہو گئے اور فرداً فرداً مصافحہ کے لیے ٹوٹ پڑے۔ اُسے یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔

جب کافی دیر ہو گئی اور کسی نے اپنی زبان کو جنبش نہ دی تو اسے حیرانی ہوئی۔ اور یہ حیرانی لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ لوگ ابھی تک احترام کا بادہ اوڑھے اس کے سامنے کھڑے تھے جیسے اس کے حکم کے منتظر ہوں۔ پھر اس نے اپنی بیوی کو آتے دیکھا۔ جس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔ اس نے اشارے سے اسے اندر بلایا۔

”وہ آپ سے مسلسل باتیں کر رہے ہیں اور آپ ہیں کہ ان کا کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔“
 ”کیا کہہ رہی ہو؟ ان لوگوں نے ابھی تک کوئی بات ہی نہیں چھیڑی۔ تم مجھے پاگل بنا دو گی۔“
 جب وہ بیوی سے دامن چھڑا کر ڈرائیونگ روم میں داخل ہوا تو سارے لوگ چائے پی کر رخصت ہو چکے تھے۔ میز پر خالی دھری ہوئی پیالیاں جیسے اس کا منہ تک رہی تھیں۔
 یہ آنے والے بھی عجیب لوگ تھے جو آئے اور چلے بھی گئے۔ مگر وہ یہاں آئے کیوں تھے۔ کوئی سبب۔ کوئی وجہ۔ کوئی کام۔ کچھ بھی تو نہیں۔ وہ جھجھلا سا گیا۔

”وہ کوئی عام لوگ معلوم نہیں ہوتے تھے۔“ کسی نے سپاٹ لیجے میں کہا۔ اور آگے بڑھ کر ٹی وی کے بیٹن کو گھما دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ اس کی بیوی کی آواز تھی جو سفید ساری میں لمبوس ایک سوا الیہ علامت بنی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

اب اسکرین پر وہی گھسیٹی سیریل چل رہی تھی جس سے بچنے کے لیے وہ دنوں سٹرک پر ناپت رہا تھا۔

جب اس کی بیوی نے کرسی سے اٹھ لی تو وہ دبے پاؤں گھر سے نکل پڑا۔

سڑک انسانی قافلوں سے لدی ہوئی تھی۔ سیٹلن۔ کادیں، رکشاٹیں اور سکوٹرول سے بھرتا بچا تا جب وہ سڑک کے کنارے آیا تو اس کی پیشانی پر پسینے کی دو ایک بوندیں چمک رہی تھیں۔
 اب وہ کھویا کھویا سامریل ٹیٹو کی طرح سڑک پر چل رہا تھا۔ شام نے اپنے بادبان کھول رکھے تھے اور ہوائیں ساٹیں سناٹیں کر رہی تھیں جیسے پیچ رہی تھیں۔ پھر ایک بار اس کے دماغ کے پردے پر کچھ آدھی ترچھی تصویریں ابھرنی لگیں۔ ڈوبتے ابھرتے لٹے چہروں کو جھٹکنے کی اس نے بہت کوشش کی لیکن بے سود۔

آخر وہ کون لوگ تھے۔ کیوں اس سے ملنے آئے تھے۔ اگر انہوں نے چپ کی چادر اوڑھ بھی رکھی تھی تو کم از کم وہ خود ہی پہل کر کے پوچھ لیا ہوتا۔ کیا وہ ان ہی کاموں کے لیے رہ گیا ہے؟ یہ کام وہ خود بھی تو کر سکتے تھے۔ مگر ساجدہ نے یہ کیوں کہہ دیا کہ ان لوگوں نے اس سے..... کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ آئے ہی نہ تھے اور خواہ مخواہ۔ نہیں نہیں وہ آئے تھے اُس سے مصافحہ بھی کیا تھا اڈو چائے بھی پی تھی۔ وہ پھر ایک بار گر بڑا سا گیا اور چلتے چلتے ایک لمحہ کے لیے ٹک گیا۔ اوپر آسمان کی چادر پھٹنے سے پہلے بادل کی طرح گرج رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے بہت بڑا طوفان آنے والا ہو بلکہ پہلے کی بوند باندی کے بعد جب دفعتاً بارش نے زور پکڑا اور بجلیوں نے بے تحاشہ چمکانا شروع کر دیا تو وہ شیشے کی تلاش میں ایک سائیاں کے نیچے جا کھڑا ہو گیا جہاں پہلے ہی سے کئی لوگ جمے تھے۔ وہ سامنے والے ہوٹل میں داخل ہونا ہی چاہتا تھا کہ لائٹ آف ہو گئی اور ایک مہیب سا اندھیرا اس کے اطراف منڈلانے لگا اُس نے سوچا۔ اب وہ اندر جا کر کیا کرے گا۔ مگر لائٹ یہی ہوٹل کے منیجر نے موم بتیاں تو جلا رکھی ہوں گی۔

”اور اندر چلے آئیے صاحب۔ لائٹ ابھی جاوے گی۔“ کسی نے اسے آتے دیکھ کر کہا۔ ہوٹل میں چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ میزوں پر دھری چھوٹی چھوٹی کچھ موم بتیاں اپنی آخری سانسیں لے رہے تھیں اور ادھر ادھر کچھ رہے ہوئے لوگ اسے ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے کچھ عجیب پر اسرار فضا تھی۔

دروشتی اگر زندگی کی علامت بن سکتی ہے تو کیا تاریکی موت کا استعارہ نہیں بن سکتی۔“
 دو کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ پھر اس کے بعد ایک لمبی سی چُپ۔

اسے محسوس ہوا کہ وہ غلط جگہ آ گیا ہے۔ اگر وہ سلا دھار منیجر ہر سادہ ہوتا تو وہ یہاں کیوں پہلا آتا۔ کوئی اور جگہ ڈھونڈ لیتا۔ ایک گوشہ تنہائی پھر وہ اندر صرف اس کی ذات اس کا وجود۔ مگر یہ لائٹ آخر کب آئے گی۔ بارش کب ختم ہوگی۔ کوئی بھی تو نہیں جانتا اسے یہ چھوٹا دلاسا ہی دے سکے۔ مگر وہ اجنبی چہرے۔ وہ لوگ۔

جب ٹیلی پر دھری بیابا موم بتی نے آخری سانس لی تو کوئی اندھیرے کی چادر میں لپٹا بیچ اٹھا۔

”و اے بھائی یہاں کوئی آئے“

پھر دفعتاً ایک زوردار گرج کے ساتھ بادلوں کے قافلے ایک دوسرے سے اس طرح ٹکرائے
 کہ لہراتی ہوئی بجلی شیشوں میں چھپے چہروں کو جیسے ٹٹولنے لگی۔ ایک لمحے کے لیے جب اس کی
 نگاہ اُن عجیب و غریب چہروں سے ٹکرائی تو وہ یکبارگی بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔
 ”اے یہ تو وہی لوگ ہیں جو اُس کے گھر.....“

اندھا کنواں

روز کی طرح آج بھی وہی اندھے مہیب ساعے رینگ رہے تھے۔ گو اس نے گھر کے سارے کمرہ کی روشنی جلا رکھی تھی، لیکن ہر بار اُسے ہی احساس ہوتا تھا کہ یہ مہیب ساعے آٹا فائناں اس کے اپنے وجود کو کسی خوشحوار آدھے کی طرح نگل جائیں گے۔ اور وہ چپ چاپ ایک اندھے اور بے نا کغویں میں گر پڑے گا، لیکن اس کا اپنا یہ گھر بھی تو ایک اندھا کنواں ہی ہے، جہاں وہ روز ڈوبتا رہا ابھرنا رہتا ہے۔ اُسے احساس ہوا جیسے کوئی دبے پاؤں اس کے گھر کی چوکھٹ پر آکر اُسے آواز سے رہا ہو۔

اسے کون آواز دے گا۔ کوئی بھی تو نہیں، جو اُسے اس کے اپنے نام سے پکارے۔ نہ کوئی یا نہ نہ گسار۔

اس کے اپنے ہی بچے جب ایک روشن مستقبل کا بہانہ بنا کر اُسے تنہا چھوڑ جائیں تو وہ کسی اور سے کیا گلہ کرے گا۔ یہی ناکہ تم بھی میرے بچوں کی طرح خود غرض ہو۔

نہیں نہیں۔ اس کے سارے دوست تو ایسے نہ تھے کہ وہ ان پر رنجت بھیجے۔ وہ اس سے لئے آئیں تو وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلا جاتے، اور جب وہاں بھی آکر اسے دبوچ لیں تو وہ بھال سا ہو کر کسی رنجی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگے اور وہ —

پھر اس نے دیکھا اس کے آگن میں ایک کالا کلوٹا کو امرا پڑا تھا، اور دیواروں سے چمٹے ہوئے لاروں بد صورت کوٹے شورچا رہے تھے ہو سکتا ہے وہ بین کر رہے ہوں، شکایت کر رہے ہوں۔ ایک طرح کا احتجاج بھی ہو سکتا ہے۔ مگر اس شکایت اور اس احتجاج سے اُس کا کیا تعلق۔ کچھ بھی تو نہیں۔ مگر شور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

بڑا جان لیوا شور۔ مگر یہ کیا؟ وہ اسے چوپچ میں دبائے کہاں اٹھالے گئے۔

اب اس کے انگن میں موت کی سی خاموشی طاری ہے۔ ایک عجیب سا سکوت، جیسے چلتے اچانک رک گئی ہو، جیسے شہر کے سارے راستے مسدود ہو گئے ہوں۔ مگر اس وقت اس دروازے کی چوکھٹ سے چمٹا کون کھڑا ہے۔

نہیں نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔ یہ اس کا دواہمہ ہے، مگر وہ تو اسے دکھائی دے رہا ہے اس کے منہ پر ہونٹ ہولے ہولے ہل بھی رہے ہیں۔ جیسے وہ ایک کرب اور آزمائش سے گزر رہا ہو مگر وہ چوکھٹ سے چمٹا کیوں کھڑا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُسے ان کالے کلوٹے بد صورت کو انتظار ہے۔ جو اُسے اپنی نکلی چوپچ میں دبائے دُور بہت دُور۔

نہیں نہیں یہ تو ایک۔

کیا کسی نے آواز دی۔

آواز۔۔۔؟

آواز کی چھتیاں تو کب کی طوفانی کی زد سے گر چکیں، اب یہاں ایک کھنڈر ہے۔ حرف کھنڈر۔ ایک قبرستان مگر کھنڈر میں بھی لوگ پانی کی تلاش میں آنکلتے ہیں۔ وہ لوگ کہاں میں انہیں ڈھونڈتا ڈھونڈتا تھک سا گیا ہوں۔

جب میرے بچے خود میرے لیے عصا پیڑی زمین سے، تو وہ لوگ۔۔۔ نہیں ہیں۔ دریا بھی لوگ سہی جیا لے اس کے بیٹے ہیں۔ اس کے بچے ہیں۔ ورنہ اس ویرانے میں کون آتا ہے۔ کیا پڑی ہے کہ اس کے گھر اگر ایک نظر سے بھی دیکھ ڈالے۔ مگر روشنیوں سے بھرے اس گھر ریگستا ہوا یہ مہیب سناتا۔ یہ تاریکی!

مگر وہ کب تک اس طرح گھٹ گھٹ کر بیٹے گا۔ آخر کب تک۔

وہ آدمی کچھ بولتا بھی تو نہیں۔ اُسے بولنے سے کس نے منع کیا ہے۔ کسی نے بھی تو نہیں تو پھر اُس نے یہ چپ چا در کیوں اوڑھ رکھی ہے۔ وہ اس گونگی چادر کو تار بھی تو کر سکتا ہے۔ وہ اس کے سامنے منکا ہونا نہیں چاہتا۔ وہ اپنا لباس اپنی چادر کیوں تار تار کرے۔ کوئی وجہ۔ کوئی سبب، کچھ بھی تو نہیں۔

ایسا سوچنا ہی غلط ہے۔ پھر صحیح کیا چیز ہے، کوئی چیز صحیح نہیں ہے۔ پھر بھی سب کچھ صحیح ہے۔
 مگر درمیان میں کوئی تو چیز ہوگی۔ کوئی راستہ۔ کوئی منزل۔
 منزل کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، اور نہ راستے کی کوئی منزل۔
 کیا کسی نے مجھے آواز دی۔

نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔
 پھر یہ آواز کہاں سے آرہی ہے۔

آواز۔۔۔؟

کون سی آواز۔

آواز کا کوئی نام نہیں ہوتا۔

رشتہ تو ہوتا ہوگا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ چوکھٹ پر کھڑے کھڑے ہی وہ چل بسا ہو۔

مگر وہ اس ویرانے میں آکر کیوں مرنا پسند کرے گا۔ کیا اس کے لیے اب ایسا کوئی سائن بیان
 نہیں جہاں جا کر وہ۔۔۔

مگر یہ آواز۔۔۔ یہ شور۔۔۔ کہیں اس کے آنگن میں پھر کوئی کالا کلوٹا بد صورت سا کوا
 مرا پڑا نہ ہو۔

پھر یہ کائیں کائیں۔ یہ جان لیوا شور۔ یہ بکھرے ہوئے دانے۔ یہ نچے ہوئے پر۔
 یہ سب کچھ کیا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔

محض ایک واہمہ۔ ایک خواب

کیا کوئی جاگتے ہیں بھی خواب دیکھ سکتا ہے۔

ہاں۔۔۔ دیکھ سکتا ہے۔ ضرور دیکھ سکتا ہے۔

ہیں خواب میں ہنوز کہ جاگتے ہیں خواب میں۔

مگر یہ بات کہنے والا تو کبھی کا۔

مجھے کچھ بھی نہیں معلوم۔۔۔

پھر اسرار کا یہ پردہ کب پٹے گا۔

کون سا اسرار۔ کون سا پردہ؟

وہ جو ہمارے درمیان ہے۔

مگر میرے گھر کے سارے زخمی پردوں کے درمیان صرف تیں ہوں، یا میرا وجود، تم ادھر کہاں بھٹک کر آگئے۔۔۔۔۔ سارے راستے تو بند ہیں۔

راستے تمہارے لیے بند ہو سکتے ہیں میرے لیے نہیں۔

ویسے بھٹکتا ہی شاید ہوش مندی کی علامت ہے۔

شاید۔۔۔۔۔ سے تمہاری کیا مراد ہے۔

اپنی ذات کی بازیافت۔ جو تمہاری بھی ہو سکتی ہے۔

میری۔۔۔۔۔؟

ہاں تمہاری۔۔۔۔۔؟ تم نے تھوڑی دیر پہلے ہی کہا تھا نا کہ تمہارے گھر کے دروازوں کے

سارے پردے تو زخمی ہو چکے ہیں۔ گھر کے زخمی پردوں کے درمیان صرف تم ہو۔ یا پھر تمہارا وجود۔

ہاں کہا تو تھا۔ مجھے اس سے کب انکار ہے۔

انکار اقرار کے آگے ہاتھ جوڑتا ہے یا اقرار انکار کے آگے؟

میں الفاظ کے ان گورکھ دھندوں میں پھنسنا نہیں چاہتا، تم یہاں آکر مجھے خواہ خواہ کچھ کے

لگا رہے ہو۔ خدا کے لیے یہاں سے دفع ہو جاؤ۔

کیوں گھبرا گئے۔۔۔۔۔ وہ بھی اتنی جلد۔۔۔۔۔؟

سچ کا کڑوا زہر جس نے پی لیا ہو۔ وہ کسی سے کیا گھبراے گا۔

مگر میں دیکھ رہا ہوں تم مجھ سے گھبرا رہے ہو۔

تم نے شاید یہ زہر صرف ایک بار پیا ہے۔

میں سچ کے اس کڑوے زہر کو روزانہ چکھتا ہوں، بلکہ پیتا ہوں، کسی ٹھنڈے مشروب کی طرح

جی آہستہ۔۔۔۔۔ کبھی تیز۔۔۔۔۔ بہت تیز۔

اس پر بھی تم زندہ ہو۔؟

دیکھ نہیں رہے ہو۔ میں تمہارے سامنے ہی تو کھڑا ہوں مجھے ٹٹولو۔ مجھے تلاش کرو۔ کنویں میں جب ڈول نہ گرائے تو پانی کس طرح پیو گے۔

میں تو پیسا سا ہوں جس کے لیے کنواں خود روز چل کر آتا ہے، اور میری پیاس۔ مگر لگتا ہے جیسے تم پھر بھی پیاسے ہو۔ جہنم کے پیاسے۔

کیا تم مجھے یہاں ہی جلی کٹی سنانے کے لیے آئے ہو۔

ہاں ہر نقاب کے پیچھے ایک حقیقت اور ہر حقیقت کے پیچھے ایک نقاب۔

تم کہنا کیا چاہتے ہو۔

کچھ بھی نہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ وہ میں نے کہہ دیا۔ اب میں خود ایک کاسہ بکھ ہوں

..... بالکل تمہاری طرح !

مگر یہ کیا۔؟ پھر وہی شور۔ وہی جان لیوا اور کربہ آوازیں۔

کاٹیں۔۔۔ کاٹیں۔۔۔ کاٹیں۔۔۔

اُسے محسوس ہوا جیسے ساری دنیا کے بد صورت اور کالے کلوٹے کوٹے اس کے وجود کے سارے ٹکڑوں کو اپنی نوکیلی چونچ میں دبا دے ایک نامعلوم سمت کی طرف پرواز کر رہے ہوں !!

میں نے

اور وہ جلدی جلدی اس واقعہ کو سنانے لگا جو ابھی ابھی اس پر بیت چکا تھا۔ اس کی باتیں کچھ بے ربط سی تھیں واقعات پیش کرنے میں شاید وہ مبالغہ سے کام لے رہا تھا لیکن اس کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دور سے پیدا ہو کر یہاں آیا ہے۔

وہ دراز دراز تنگ روم کی کھڑکیاں کھول دو، مجھے گھبراہٹ سی محسوس ہو رہی ہے ممکن ہو تو ایک گلاس پانی ہی پلا دو۔، اٹنا کہہ کر اس نے اپنے پاؤں آرام کر سی پر اس طرح جمادینے جیسے وہ چند لمحوں کے لیے سکون چاہتا ہو۔ میں نے اس کے سامنے پانی کا گلاس لاکر رکھا مگر وہ پانی پینے کے بجائے سگریٹ پینے لگا پانی یوں ہی دھرا رہا۔

میں نے اس سے کچھ نہ کہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود بات آگے بڑھائے اب تک اس نے جو کچھ بھی مجھ سے کہا تھا وہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ دو اب میں اُس کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔، درمیان میں بڑے کرب کے ساتھ اس نے یہ جملہ کہا تھا۔ وہ طہری دیر تک چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ وہ میں نے تم سے پانی منگوایا تھا شراب کا جام نہیں جس کے لیے تمہیں بھولنے پر مجبور ہونا پڑا۔، اس نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔

میں بجائے جواب دینے کے سامنے دھرا ہوا گلاس اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ وہ غما غٹ پانی پی گیا۔

وہ ہاں میں خوب سمجھتا ہوں۔ یہ بھی سمجھتا ہوں کہ تم رات بھر ہو،، کیا تم بتا سکتے ہو زمین کے عذاب سے تنگ اگر ان مردوں نے کس انداز

سے مجھے دیکھا تھا مگر قبر کے وہ دروازے اچانک کیوں مقفل ہو گئے۔

تم کہو گے دائمی تنہائیوں کا کرب وہ اپنے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اٹھا لے گئے
تو نہیں ایسا تو نہیں میں یہاں اپنی حماقت کا کفارہ ادا کرنے چلا آ گیا۔

مجھے وہ پہلی سیڑھی یاد ہے جس پر چڑھ کر میں نے سوچا تھا کہ منزل پر
پہنچ جاؤں گا۔ لیکن مجھے بعد میں پتہ چلا کہ پہلی منزل سے آگے ایک دوسری
منزل بھی ہے جہاں پہنچنے سے پہلے مجھے ایک بار ٹھہر کر کھانی ہے۔ لیکن میں ابھی تک
پہلی سیڑھی ہی پر کھڑا ہوں۔ دوسری منزل کے زینے پر ٹہرے ہوئے اس آدمی
کو میں اچھی طرح جانتا ہوں جو ہمیشہ چہرے پر نقاب اوڑھے رہتا ہے۔ وہ
زینے سے اس طرح چمٹ گیا ہے جیسے وہ آدمی نہیں جو تک ہو۔ مگر پھر بھی میں دیکھتا
ہوں کہ لوگ سڑک پر چلتے ہیں۔ پتہ نہیں ان لوگوں کو سڑک پر اس طرح چلنے کی
عادت کیوں پڑ گئی ہے۔ کیا مسلسل چلتے رہنا بھی ایک ہوس ہے۔ یہ لوگ کس
کے تعاقب میں ہراساں ہیں مگر وہ دوسری منزل سے چمٹا ہوا آدمی۔

کیا تم بتا سکتے ہو کہ میں وہاں کیسے پہنچ سکا۔ جب کہ دوسرا زینہ۔
ایک بار پھر وہ چپ ہو کر رہ گیا۔

شام دھواں دھواں سی لگ رہی تھی۔ ہوا کے دبیز جھونکے کھڑکیوں
کو پھلانگتے ہوئے دہلے پاؤں اندر داخل ہو رہے تھے۔

وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس واقعہ کا سب سے اہم کردار میں ہی
ہوں۔ اس کی بے ربط باتوں کو سن کر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر چیز سر تا پا
بھوٹ ہے۔ برہنہ ہے۔ ہر سکما ہٹ کے پیچھے ناکام آمد و رفت کا ایک ہجوم
ہے جس میں شاید وہ گھرا ہوا ہو۔

تم کیا سوچ رہے ہو۔ یہ میں جانتا ہوں۔ تمہاری خاموشی اس پرندے کی
انند ہے جو صدیوں سے ایک ہی درخت پر بیٹھا ہو۔ رات طے یہ کہہ کر وہ بجائے
سکرانے کے بے ساختہ منس پڑا۔ اس کی یہ منسی مجھے بڑی بھیانک لگی۔ ایسا

معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی دیوان قبرستان میں کوئی آکھول رہا ہو۔

دوسری منزل کا وہ کشادہ زمین اور اس سے چمٹا ہوا وہ آدمی۔

رات روشنی اندھیرا۔ اندھیرا روشنی اور پھر رات اور رات کی کوکھ سے

جنم لینے والے نقلی چہرے۔ گھر کی طرح غائب ہوتے ہوتے یہ مصنوعی لوگ۔
دیکھو چھت پر کسی کے چلنے کی آواز آرہی ہے۔

اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ اس کے چہرے پر ادا سیالیاں نوہر گھبریں ایسا

لگتا تھا جیسے وہ ایک ایسی نعش ہے جسے قبر نے بھی قبول کرنے سے
انکار کر دیا ہو۔

وہ منگھیرتا ہوا واہہ ہے۔ وہ تو رات کے قدموں کی چاپ سے جو آہستہ آہستہ
وینٹے ہوئے ہمارے سروں پر سے گزر رہی ہے۔ صبح کے شبنمی نظارے کا

لطف شانہ تمام نے کبھی نہیں اٹھایا۔

وہ رات کمنٹر بن کر آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ میرے لیے رات اور دن ایک ہی

چیمبر کے دو نام ہیں۔ میں ان مہم سرگوشیوں کی سرسراہٹ سے واقف ہوں۔ جو

میرے سینے کو روندتے ہوئے ہوا کے جھونکے کی طرح دور نکل جاتی ہے۔ منگھیریں

تو ابھی تک پہلی منزل کی پہلی سیڑھی ہی پر کھڑا ہوں۔ کیا تم مجھے ایک اور گلاس

پانی پلاؤ گے۔ اس نے کھوئی کھوئی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

کیوں نہیں ضرور کہہ کہ میں نے اس کے سامنے پانی سے بھر دوسرا گلاس

رکھ دیا۔ تم بھی میری طرح بڑے تابدار ہو۔ اور ایک اچھے میزبان بن سکتے ہو

لیکن جب مہمان دلیل ہو تو میزبان کی شرافت اس دسترخوان کی طرح ہو جاتی

ہے جسے کہیں بھی جھٹک دیا جائے ہے۔ آج میری حالت بھی اُسی دسترخوان کی

سی ہے۔ یہ کہہ کر وہ رو ہانسا ہو گیا۔ اس کی پھوٹی پھوٹی بھوری آنکھوں کے کونے

میں آنسوؤں کی موسوم لگیں علامت دکھاتی دے رہی تھیں۔ اب الگ رہا تھا

جیسے وہ اپنی موجودہ زندگی سے کافی اکتا گیا ہو۔

وہ جو آدمی پہلی سٹیرھی کو اپنی منزل سمجھے اس کے لیے دوسری منزل کا زمینہ زخم بھی بن سکتا ہے، اور بدوا بھی۔،

اس نے میرے ذہن میں چھپے ہوئے اس جملہ کو یوں دہرایا جیسے یہ جملہ میں نے نہیں اس نے کہا ہو۔

مجھے حیرت ہوتی کہ اس نے کیوں طنز یہ انداز میں مجھے رانتھڑ کہا تھا۔
پھر قدرے توقف کے بعد اس نے کہا۔ دو بوجھ اٹھانے سے گردن جھک جاتی ہے اور گردن کا جھک جانا ندامت کی علامت ہے۔ مگر میں نے یہ زہر بھی پی لیا ہے۔ میرے رگ و پتے میں شائد ہی زہر سرایت کر چکا ہے۔

پہلی منزل کی سٹیرھی پر قدم رکھ کر دوسرے زمینے کی تلاش میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ مگر تم تو ایک رانتھڑ ہو۔ وہ تحقیر آمیز انداز میں مسکرایا۔ میں نے درمیان میں اُسے ٹوکنے ہوئے کہا۔ دو آج کے بعد شاید تم اس سے پھر نہ ملو گے۔،

شائد ایسا ہی ہو۔ کیوں کہ آنے والے کل کے سو راج کو کس نے دیکھا ہے۔
رات میں طلوع ہوئی والے اس زرد و سفید چاند کو بھی کوئی روز دیکھ سکتا ہے مگر میرا المیہ دوسری منزل کا پہلا زمینہ ہے۔

جس سے وہ آدمی جو تک کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ میں پہلی منزل پھلانگ کر بھی۔
دوسری منزل کے اس زمینے تک پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں یہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔،
بوجھ اٹھانے سے گردن جھک جاتی ہے نا۔، آخری جملہ ادا کرتے ہوئے وہ قدرے خجالت سی محسوس کر رہا تھا۔ پھر وہ یکبارگی اٹھ کھڑا ہوا اور تیز تیز قدم ڈالنا ہوا ڈرائیونگ روم سے باہر پٹرک کے بھوم میں کھو گیا۔

اُداس نسل کا آخری آدمی

وہ لوہے کے بنے اس بڑے پھیلے ہوئے پل پر کھڑا تھا۔ جس کے نیچے وسیع تالاب تھا اور تالاب کا ساکت پانی چاندی کے ورق کی طرح صاف اور اُجلا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے تنہا کھڑا تھا۔ لیکن اب لوگ باگ جمع ہو گئے تھے۔ دراصل وہ لوگوں ہی کا انتظار کر رہا تھا کہ خود کشی کرتے ہوئے سب لوگ اُسے دیکھ سکیں۔ وہ تنہا اگر پانی میں چھلانگ لگا دے اور یوں ہی مرجائے تو یہ گمنامی کی موت ہوگی۔ وہ سب کے سامنے پانی کی آغوش میں غوطے کھاتا رہے گا تو بہ ظاہر کوئی نہ کوئی اللہ کا بندہ چھلانگ لگا کر اُسے بچالے گا۔ اور وہ اس طرح زندہ رہ سکتا ہے۔ مگر آج جو اس نے خود کشی کا ارادہ کر لیا ہے وہ اس طرح سلیقے سے پورا ہونا چاہیے کہ وہ بیک وقت موت اور زلیست کا مزہ چکھ سکے۔ زلیست کا مزہ چکھے ہوئے اسے بیس برس ہو چکے تھے۔ اب منہ کا مزہ بدلنے کے لیے خود کشی کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے وہ ساری باتیں غور سن رہا تھا۔

پہلے ہی سے کونے خوشحال تھے۔ اب اس گرانی نے تو کہیں کا نہ رکھا۔ سکوٹر گھر میں رکھ دی ہے۔ پٹرول پر اگر ہر ماہ دیکھ سو روپے اٹھ جائیں تو اس سے بہتر ہے آدمی پیدل چلے۔“

”مگر پیدل گھوڑے سے آدمی باغی ہو جاتا ہے۔ تم تو صدی ہی سے صلح پسند آدمی ہو۔“
 ”وہ یا تو پل پر کھڑا ہو کر بھی ایسی باتیں کرتا ہے۔“

و انہیں پٹرول کی پٹری ہے اور میں کھانے کی۔ بازار میں کھانے کی کوئی چیز ہی نہیں ملتی۔

و سب جھوٹ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ساری ہوٹلیں بند نہ ہو جاتیں۔»

و یاد تو سدا کا جھکٹی ہے۔ اب تیرے سامنے کون اپنا دماغ خراب کرے۔»

و دماغ ہو تو خراب ہو گا۔»

و تیرا مطلب ہے کہ میں بے دماغ ہوں۔»

و یاد تو مذاق بھی نہیں سمجھتا۔»

و مذاق سمجھا نہیں جاتا محسوس کیا جاتا ہے۔ اُس نوجوان کو دیکھ پل پر چپ چاپ کس طرح

کھڑا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے غلیل جبران نے پھر ایک بار جنم لیا ہو۔»

و وہ چپ چاپ گہری سوچ کا لبادہ اوڑھے بُت کی طرح کھڑا تھا۔

و غلیل جبران یہ تو بہت بڑے اور بہت پرانے آدمی کا نام معلوم ہوتا ہے۔ کم نجات نے نام لیا

بھی تو اس آدمی کا جس کا صفحہ ہستی پر اب کوئی وجود نہیں۔ مگر وہ جو لوگ کہتے ہیں کہ رب

اوقات آدمی مر کر بھی امر ہوتا ہے۔ شاید یہ اسی قبیل کا آدمی ہو۔ مگر اُسے نہ مرنا ہے اور نہ جینا

وہ اپنے اس عجیب و غریب مضحکہ خیز خیال پر آپ ہی آپ مسکرایا۔

و سالہا اب کہیں جا کر مسکرایا ہے۔» اس کو منٹ پر اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ

قدوے سے سکڑ کر رہ گئی۔

و تو نے تو اسے پوری طرح مسکرانے بھی نہیں دیا۔»

و تیرا مطلب ہے اس نے میری بات سن لی۔»

و اور نہیں تو کیا۔»

و ادھر دیکھ۔ پھر وہ مسکرا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے اس نے میری بات نہیں سُنی۔»

و یاد تو تو ہر بات میں دلیل چاہتا ہے۔»

و مگر یہ کیا پھر وہ سنجیدہ ہو گیا ہے۔ کیا لبوں پر مسکراہٹ چند لمحوں کے لیے آتی ہے۔»

و ہم یہاں تفریح کے لیے آئے تھے تو نے بور کرنا شروع کر دیا۔ اس سے بہتر ہے اپنی روپا رانی

کے ہال چلیں۔»

و وہاں تو ہمیشہ ”وکیو“ لگا رہتا ہے۔“

و ارے کیو توڑنا کونسی مشکل بات ہے۔ بازوؤں میں قوت ہو اور پیسہ ہو تو کیو کی کیا حقیقت ہے۔ دو چار چلتے ہوئے گانے تو سن سکتے ہیں۔“

اب ان لوگوں کی توجہ دوسری طرف منعطف ہو چکی تھی۔ اور وقت ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ اس نے کوٹ کی جیب سے سگریٹ کا پیکیٹ نکالا اور سگریٹ کے مرغولے فضا میں لہرائے لگا۔

و دیکھ یہ دھوئیں کے مرغولے کس قدر خوبصورت بنا رہا ہے۔ بڑی انفرادیت ہے سالے میں۔ مگر اس کا یہ اکیلا پن۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہماری اُداس نسل کا آخری آدمی ہے۔“
اب دوبارہ اتنی وقتی طور پر پس منظر میں چلی گئی تھی۔ اور وہ موضوع بحث بنا ہوا تھا۔
و یا راس سے چل کر ملیں۔“

و تو جا میں بغیر تعارف کے کسی سے ملنا پسند نہیں کرتا۔“

و یا ہم تو کھلے اشتہار ہیں وہ خود پوسٹر پٹھ لے گا۔“

قبل اس کے وہ کسی نتیجے پر پہنچتے ہی پر کھڑے ہوئے آدمی نے تیزی سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ تالاب کے ساکت پانی میں جیسے کسی نے بہت بڑا پتھر پھینک دیا ہو۔
اب وہ غوطے کھا رہا تھا۔

و ارے اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔“ وہ متحیرانہ انداز میں چیخ پڑے۔

و اسے بچا لو بھائی لوگ، اور بھائی لوگ اُسے ڈرویتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

وہ ایک لمحہ کے لیے پانی کی سطح پر نمودار ہوتا اور پھر دوسرے ہی لمحے غائب ہو جاتا۔
سب لوگ ہی چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح بچ جائے لیکن کسی میں اتنی بہت نہیں تھی کہ پانی میں سے اُسے نکالے۔ لوگ خوف کے مارے اپنی اپنی جگہ پر چپ چاپ کھڑے تھے۔ سب چیخ رہے تھے۔ پکار رہے تھے۔ لیکن کوئی پانی میں چھلانگ لگانے کو تیار نہ تھا۔ وہ پانی کی سطح پر ڈول رہا تھا۔ لوگوں کی زبانوں سے نکلے ہوئے جملے قطرہ قطرہ زہر کی مانند اس کے کانوں سے دل میں اتر رہے تھے۔ پندرہ بیس آدمیوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو اُس

کے لیے چھلانگ لگا سکے۔ اب اس کے لیے مرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لوگوں نے پھر ایک بار سطح پر نمودار ہوتے ہوئے اُسے دیکھا۔

دو یا دہڑدھٹ ہے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک مر گیا ہوتا۔

دو مرنا بہت آسان ہے یا دہینا بہت مشکل ہے۔ بھلا وہ اتنا احمق تھوڑا ہی ہو گا جو موت سے دامن چھڑا کر زندگی کے آچل میں منہ چھپالے۔

دو یا رکیوں ہندوستانی فلموں کے ڈائلاگ دہرا رہا ہے۔ اُسے دیکھ وہ تو غوطے کھاتے کھاتے چت ہو گیا ہے۔ جیسے مر نہیں رہا ہو بلکہ کسی ماہر پیراک کی طرح تیر رہا ہو۔

اب وہ سچ پچ جیسے تیر رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے اور پانی کے اندر اس کے پاؤں حرکت کر رہے تھے۔

وہ کد کد آگے بڑھ رہا تھا۔ لوگوں کے چہروں سے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے پنج نکلنے پر وہ خوش نہیں۔

جب اچانک کنارے پر پہنچ کر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تو سب لوگ منہ لٹکا کر ایک دوسرے کو یوں تک رہے تھے جیسے وہ اپنے آپ شرمندہ ہوں۔

پھانس

ایک طویل مدت کے بعد جب اچانک اُس سے میری مدد پوچھی گئی تو وہ مجھے کافی بُدھال اور مردم گزیدہ سا لگا۔ اس کے موٹے موٹے خشک ہونٹوں کی حراب سے اس کے لگے دانت یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ دانت نہ ہوں سیتا پھل سے بچ ہوں۔

میں نے اس کی ذات میں دلچسپی لینا مناسب نہیں سمجھا۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ حتیٰ طور پر میری مدد کا محتاج ہو۔ تاہم وہ ساری پچھلی باتیں اور یادیں لگ بھگ بھلا چکا تھا۔ بھولنا اور بھلا دینا شاید اس کی کمزوری تھی۔

آج میں نے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی ویرانی دیکھی۔ ایک ایسی ویرانی جو الفاظ کے کئی حصاروں کو توڑ سکتی ہے لیکن گرفت میں نہیں آتی۔ میں جلدی میں تھا شاید میں جلدی میں نہیں تھا۔

پھر وہ کونسا جذبہ تھا جس نے مجھے نہ آگے بڑھنے کی اجازت دی اور نہ پیچھے ہٹنے کی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آئندہ پھر کبھی ہم فرصت سے ملاقات کر سکیں۔“

”نہیں۔۔۔ نہیں، جو بات بھی ہوگی آج ہی ہوگی۔ اس کے بعد کبھی نہ ہوگی۔ میرا گھر زیادہ دور نہیں۔ کچھ مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے یاروں ہی کے سامنے اس کا ذکر کر سکتا ہے۔“

”تم عمارت کی بنیادیں غلط پتھر رکھ رہے ہو۔ تمہیں یقین ہے کہ میں تمہارے مسائل میں دلچسپی دکھاؤں گا۔“

”یقین ہے اور ساتھ ساتھ اعتماد۔۔۔ اور پورا اعتماد۔“

یقین اور اعتماد میری نظر میں بڑے بودے لفظ ہیں۔“

ٹریفک کے شور میں میری باتیں شاید وہ سن نہیں پا رہا تھا اور اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔

دو۔ اچھا ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ کوئی گوشہ تنہائی تلاش کریں اور وہاں بیٹھ کر.....

دراصل ان بھاگتے دوڑتے چہروں کو دیکھتے دیکھتے میں اُوب سا گیا ہوں۔ وہی سڑکیں۔

وہی ہوٹلیں، وہی لوگ لیکن مدتوں بعد تمہارے چہرے کی زیادت نصیب ہوئی ہے تو میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ دیر دید کا بار اٹھا لوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اُداسی کا ایک نوحہ بن گیا۔ میں نہ چاہنے کے باوجود اس کے ساتھ ہولیا۔

وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اس کا گھر اس کی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند و بالا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اسی کا گھر ہے۔ سڑکوں کو اسی سے گزرتے ہوئے سلام کہتے اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ کر میں ویسے بھی دم بخود تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر اطمینان کی لہریں ہو رہی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ اس نے اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے۔

کیا بھابی گھر میں نہیں ہے۔“

کس کی بھابی تمہاری یا میری۔“

اس کے جواب کے بعد مجھ میں اتنی ہمت نہیں رہی کہ مزید میں اس سے کوئی اور سوال کر سکتا۔

چائے پیو گے۔ یا ڈرنکس لو گے۔“

چائے ہی ٹھیک رہے گی۔“

میں اپنی مرضی کبھی کسی پر نہیں ٹھونکتا۔ تم نے چائے کے علاوہ ذہر کی بھی فرمائش کی ہوتی تو

میں خوشی خوشی ذہر کا پیالہ تمہارے ہاتھ میں تھما دیتا اور ہمیں مارتا ہوا دیکھ کر اطمینان محسوس کرتا کہ

کہیں تو میرا وجود کسی کے کام آیا۔ دراصل میں یہاں تمہیں اس لیے لایا تھا کہ اپنے بارے میں تم

سے کچھ کہہ سکوں۔ کئی دنوں سے میرے ذہن پر ایک بوجھ ہے۔ میرا ذہن دسوسوں اندیشوں

اور خوف کے بے نام سایوں سے اس طرح گھرا ہوا ہے کہ کبھی کبھی خود میرا وجود کانپ جاتا ہے۔

میں ان دنوں بڑے پیچیدہ مسائل سے گزر رہا ہوں۔“

وہ اپنے ہر تئیسرے جملے کے بعد اسی بات کو دہراتا رہا کہ مسائل بے حد پیچیدہ ہیں۔ اور

تجارت کا کوئی راستہ نہیں۔ چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں۔ وہ یہ کہتے کہتے روہانسا ہو گیا۔ اور ہانپنے لگا۔

وقت وینگ رہا تھا لیکن رازوں میں ڈھکے کہانی کے انجام سے میں ہنوز ناواقف تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کی دلجوئی نہ کر سکا۔ اب میرے لیے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا لیکن میرے مسائل اس سے مختلف تھے۔ وہ سخت ذہنی الجھنوں اور اعصابی کیفیت سے دوچار تھا۔ اور سزا میں بھگت رہا تھا۔ گھڑی کا ہر سکند ہر منٹ مجھے پہاڑ کی طرح لگ رہا تھا۔

”میرا انجام دیکھ رہے ہو۔“ اس نے ہاتھ بیڑھاتے ہوئے کہا۔
”دیکھا تم مجھے اپنے ہاتھ کی ریکھا میں بتانا چاہتے ہو۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں کہ خود میرے ہاتھ میں دھن دیکھا بھی ہے۔ اور رنگ آف سولوں بھی اور تم تو آخر چاہتے کیا ہو۔“

”میری گھڑی کی طرف دیکھو۔“ اس کا سانس پھول رہا تھا اور پیشانی پر پسینے کے باریک باریک قطرے نمایاں انداز میں دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنے ہونٹوں میں دانت اس طرح گاڑ رکھے تھے جیسے کوئی خوف کے تصور سے ہراساں ہو۔

تمہاری گھڑی تو برابر چل رہی ہے۔“

”نہیں۔۔۔ سکند کا کاٹا گھوم نہیں رہا ہے۔ غور سے دیکھو۔“

لیکن میں بجائے گھڑی کے اس کے چہرے کو حیرانی سے دیکھتا رہا۔

”اس نے کہا۔ میری موجودہ زندگی بھی کچھ ایسی ہی ہو کر رہ گئی ہے۔“

لیکن گھڑی سے ان باتوں کا کیا تعلق۔“

”وہ میرے سارے پیچیدہ مسائل اسی گھڑی کے گرد گھوم رہے ہیں۔ اور میں بالکل ہی

ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہوں۔“

میں اس کی عجیب و غریب باتوں سے عاجز آچکا تھا۔ چاہتا تھا کہ گھر سے نکل بھاگوں۔

اس نے اچانک خاموشی اختیار کر لی۔ اس کا دہلا پتلا سید طوفانی سمندر کے مدوجور کی طرح

کانپ رہا تھا جیسے وہ مدت سے بیمار ہو۔

میں اب چل رہا ہوں۔ رات کافی بیت چکی ہے۔ سن رہے ہو۔ ” مگر اُس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

اب بھی وقت ہے کسی بھی چیز کو پوشیدہ رکھے بغیر وہ سب کچھ کہہ ڈالو جو تمہارے دل میں ہے سن رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں تم سے مل کر تمہاری بے سرد یا باتوں کو سن کر ادھمکوا سا ہو کر رہ گیا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کونسی گھڑی تھی جو میری تم سے ملاقات ہو گئی۔
مجھے درابھی گمان نہ تھا کہ تم سے ملنے کے بعد.....

میں نے ابھی اپنا جملہ پورا بھی نہ کیا تھا کہ اچانک ایک خطرناک قسم کی ابابیل کمرے میں داخل ہوئی اور پے درپے کمرے کے چکر لگانے شروع کر دیے۔
اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سے ایسا لگتا تھا جیسے اُس پر ایک جنوبی کیفیت طاری ہو گئی ہو۔

میرا دل خوف اور وحشت سے بے طرح کانپ رہا تھا لیکن وہ مطمئن تھا جیسے اس کے لیے یہ روز کا معمول ہو۔

گھبراؤ نہیں ————— یہ نہیں ضرور نہیں پہنچائے گی۔ یہ ابابیل یہاں روز آتی ہے اور اپنے مقررہ چکر کاٹنے کے بعد یوں ہی چلی جاتی ہے۔ مگر دیر سے آئی ہے نا تو چکر بھی اسی تیزی سے لگتا رہی ہے۔

لو اب وہ چلی گئی — ”

واقعی ابابیل کمرے سے جا چکی تھی۔

وہ اضطراری کیفیت جو اچانک ابابیل کے آجانے سے مجھ پر طاری ہو گئی تھی۔ وہ اب آہستہ آہستہ محذوم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب بھی خاموشی کا لبادہ اوڑھے میری جانب عجیب انداز سے دیکھ رہا تھا۔

اب بھی وقت ہے، وہ ساری باتیں کہہ ڈالو۔ جس کے لیے مجھے تم یہاں گھسیٹ لائے تھے۔ سن رہے ہو۔ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ” لیکن وہ پھر بھی چپ تھا۔ میت کی طرح خاموش اور قہر کی طرح پرسکون۔

میں بڑی مایوسی کے عالم میں اس کے گھر سے باہر نکل آیا۔ مہوائیں سائیں سائیں کہ رہی
 تھیں اور سڑک پر دور دور تک ہولناک سناٹا طاری تھا۔ اکا دکا لوگ بارش میں بھسکتے ہوئے
 سڑک پار کر رہے تھے۔ میں بارش سے بچنے کے لیے ایک سائبان کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔
 وہاں کافی اندھیرا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ دو تین اور لوگ بھی یہاں کھڑے ہیں۔
 کسی نے مجھ سے پوچھا۔

”و کیا بجا ہو گا — ؟“

”و گھڑی بند ہے —“ میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا

”و تعجب ہے۔ ؟ وہ تو چل رہی ہے۔“

”و لیکن سکڑ کا کاٹنا — ؟“

پنجرہ

دھو دھواں دھواں سی سلگتی ہوئی شام اُسے آن بھی یاد تھی جب اس کھنڈر نما حویلی پر اُس نے پہلی بار دستک دی تھی۔ ایک نہیں کئی بار۔ مگر حویلی کے در و دیوار خاموشی کا لبادہ اوڑھے کسی بے جان بُت کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے۔ ہر طرح کی کوشش کے بعد جب .. کوئی شنوائی نہ ہوئی تو وہ مایوس ہو کر اس آدمی کی تلاش میں نکل پڑا تھا جس نے اسے اس کھنڈر نما حویلی کا پتہ بتایا تھا۔

مگر دور دور تک اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

آج پھر وہ اُسی حویلی کے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ مگر دروازے کے منہ پر ایک بڑا سا تالا پڑا تھا۔ ایک زنگ خوردہ عجیب و غریب تالا۔ وہ بڑی دیر تک دروازے کے منہ میں دھنسنے اس بے ڈھنگے بد صورت تالے کو بغور دیکھتا رہا۔

یہ تالا کبھی کھلے گا بھی یا اسی طرح وہ سوچ کی اتھار گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ اچانک اسے لگا جیسے دور کسی خاردار جھاڑیوں میں پھنسا ہوا آدمی زخمی لپچے میں آپ ہی آپ بڑبڑا رہا ہو۔

بند دروازوں پر دستک دینا ہی آدمی کا مقصد ہے۔

اس نے آنکھیں پھاڑ کر خاردار جھاڑیوں میں پھنسنے آدمی کو دیکھا جو اپنی ذات کی آگ میں سلگتا ہوا آپ ہی آپ جل رہا تھا۔ مگر اُسے تو اس اجنبی کی تلاش تھی جس نے اُسے ... یہ سوچ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا آگے چل پڑا۔ اُسے ایک بارگی احساس ہوا کہ وہ جس شرک پر چل رہا ہے۔ اس کے سینے سے لہو کی بوندیں آہستہ آہستہ ٹپک رہی ہیں۔ اُسے یہ دیکھ کر حیرانی

ہوی کہ لہو میں ڈوبی ہوئی اس سڑک کے آخری کنارے پر وہ اکیلا بیٹھا اطمینان سے سگریٹ سے پے دیپے کش لگا رہا ہے۔

ابھی وہ اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ وہ اچانک بول پڑا۔
 کسی کے گھر دی ہوئی دستک کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ مگر تم حویلی کا دروازہ توڑ نہیں
 سکتے کہ تم ایک اچھے نہیں شریف زادے ہو۔ میں جانتا ہوں تم یہاں ہی کہنے آئے ہو کہ وہاں
 کسی نے تمہیں گھاس نہیں ڈالی۔ شاید وہاں وہ بوڑھا نیند کے پنگوڑے میں پڑا ہے سدا صد
 سو رہا ہو۔ مگر میں اُس بوڑھے کے کانوں تک تمہاری دستک کی بیمار آواز نہ پہنچی ہو۔

تمہیں اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے جب مقدریا وری پہاڑ آئے۔ ہو سکتا ہے
 اُس نے اپنا کاروبار ترک کر دیا ہو۔ کسی بھی یکسانیت سے آدمی جلد ہی اُوب جاتا ہے۔
 مجھے ہی دیکھو۔ کل تک بندر چھاپ بیڑی بیا کرتا تھا۔ آج سگریٹ پی رہا ہوں۔ ہو سکتا
 ہے کل سگریٹ کی بجائے کوئی اور مہنگا یا گھٹیا نشہ کا عادی ہو جاؤں۔ مگر ان باتوں۔۔۔
 تمہارا کیا تعلق۔

میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں ایک ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں تم سکھ اور شانتی
 سے رہ سکو۔ سکھ اور شانتی کا مطلب سمجھتے ہو نا۔ ؟

اب اس کے پوٹھوں پر جو سکراہٹ ریگ آئی تھی وہ بڑی قاتلانہ تھی۔ مگر میں تو اس پرانی
 حویلی کی بات کر رہا تھا۔

اب تک جو میں نے باتیں کیں۔ کیا وہ اس حویلی کے بارے میں نہیں تھیں۔ اگر میں تمہیں
 تو وہ حویلی کی پیشانی پر سنہری گتھی کا آؤریال رہنا۔ ؟

اس کی گفتگو کا وہی سلسلہ جاری تھا کہ ایک آوارہ لونڈا درمیان میں آ پٹکا۔ چھٹاٹے کا
 میرے ہاں پچاس کا ایک نوٹ ہے۔ اس نے جب دوبارہ یہی ہانک لگائی تو وہ چیخ پڑا۔ اے
 سالے ادمہ کہوں مرنے چلا آیا۔ دیکھتا نہیں ایک اہم گتھی سلسلے سمجھتے رہ گئی ہے۔ جب لونڈا اتر
 پھانڈ کر آئے نکل گیا تو اس نے اطمینان سے کہا۔

تمہیں گھر۔۔۔ ٹھکانہ۔۔۔ سا بنانا سب کچھ مل جائے گا۔ مگر کمزور اور ناتواں دستک

سے کام نہ چلے گا۔

مگر وہ وہی جگہ تو تھی جہاں تم نے جانے کا مشورہ دیا تھا۔
میں نے تمہیں راستے کی نشاندہی کی تھی۔ منزل کا پانا یا نہ پانا یہ تمہارا مسئلہ ہے۔
اب اسے اچانک احساس ہوا کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے جس نے اُسے حویلی پر پہنچ کر دستک
دینے کو کہا تھا۔ یہ اُسی کی قبیل کا کوئی دوسرا آدمی ہے جو بڑا کائیاں ہے مگر اس کا چہرہ تو
ہو بہو وہی ہے۔ نہیں نہیں یہ کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے۔ یہ وہی ہے تو پھر وہ کون تھا جس نے
اُسے.....

اب وہ ایک عجیب اضطراری کیفیت سے دوچار سڑک پر تیز تیز چلتے لگا۔ لیکن وہ سیدہ تانے
پھر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔
میں نہیں چاہتا تھا کہ اس حویلی میں دوبارہ قدم رکھوں۔ مگر تمہاری خاطر یہ بھی گوارہ ہے
یہ کہہ کر اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے کندھوں کو پیار سے یوں کھینچا یا جیسے
وہ اسی کی ذات کا ایک اہم حصہ ہو۔

اب وہ ایک آسیب زدہ انسان کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چلتے لگا۔
آج یہ سڑکیں مجھے کچھ زیادہ ہی زخمی لگ رہی ہیں۔ دیکھو لوگ کتنے کم کم دکھائی دے رہے ہیں
اور کس قدر حیراں و خوف زدہ۔۔۔ میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں
کہا۔

زمین پر انسانی قافلوں کا بڑا بوجھ ہے۔ اُسے وقتاً فوقتاً زخمی ہونا ہی چاہیے۔ تم ان باتوں
پر غور کرنے لگو گے تو کینسر میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ یہ المیہ ہی کیا کم ہے کہ ہم جی رہے ہیں۔ خواہ وہ کسی
روپ میں کیوں نہ ہو۔

پھر اس کے ساتھ وہ کب اور کس طرح اس پرانی حویلی میں داخل ہوا اسے کچھ یاد نہ تھے
جیسے کچی نیند میں اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

وہ بڑے بڑے دیوہیکل ویران سے کمرے۔ وہ عجیب و غریب دلان اور اس پر کچھ
ہوئی کئی گرد آلود دریاں۔ بنگوڑے میں چپ چاپ لیٹا ہوا وہ سفید براق سا بوڑھا۔

قدرے کھلا ہوا منہ اور پوٹوں میں چھپی ہوئی وہ ادھر کھلی آنکھیں۔ صحن میں لٹکا ہوا وہ رنگ
خودہ پنجرہ۔ جس میں ہرے رنگ کا ایک منخوس طوطا جو مسلسل ٹہر رہا تھا۔ بھاگ جا۔
بھاگ جا۔

اس نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے حوٹلی کے درو دیوار پر چپٹے ہو۔ بے شمار زہریلے کیڑوں کو
دیکھتے ہوئے دیکھا۔ کیا رنگ اسے لگا جیسے سارے زہریلے کیڑے اس کے جسم سے چمٹ گئے
ہوں۔ پھر اچانک ہوا کا ایک طوفانی جھونکا آیا۔ اور ڈولتے ہوئے پنجرے سے وحشت زدہ
طوطے کی کمریہ آواز ابھری۔

بھاگ جا۔ بھاگ جا۔

اُسے قریب ہی ایک بھاری پر اسرار آواز سنائی دی۔

اب آگے ہو تو گھبراؤ نہیں یہ یا گل طوطا تو ہمیشہ یوں ہی ٹہر رہا ہے۔

جوز

بہت بری خبر ہے۔۔۔ سلیم نے ٹور اینگ روم میں اچانک داخل ہوتے ہوئے کہا۔۔۔
 کبھی تم نے اچھی خبر بھی سنائی ہے۔۔۔

سنو شوکت کی بیوی نے زہر کھا لیا ہے۔ بچنے کی کوئی امید نہیں۔
 وہ کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جیسے سلیم کی بات اس نے سنی ہی نہ ہو۔
 سن رہے ہو میں کیا کہہ رہا ہوں۔؟

میں نے خبر سن لی ہے اب تم جا سکتے ہو۔
 سلیم ہرکا بکا اُسے بڑی دیر تک دیکھتا رہا۔
 مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو۔ اُسے زہر کھانا ہی چاہیے تھا۔
 مگر کیوں؟ شوکت تو اُسے بہت چاہتا تھا۔

صرف چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تم یہ بات نہ سمجھ سکو گے۔ مجھے پور نہ کرو۔۔۔
 یہ کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

سلیم تھوڑی دیر یوں ہی کھڑا رہا۔ پھر غصہ سے بیچ و تاب کھاتا ہوا باہر چلا گیا۔ جب سلیم
 چلا گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ تپائی پر دھرے ہوئے سگریٹ کین سے گولڈ فلیک
 کی ایک سگریٹ نکالی اور ایک لمبا کش لے کر سوچنے لگا۔ وہ یہ سلیم سالہا ایسی خبریں سننے
 سے پہلے مڑا کیوں نہیں۔

مگر یہ شام آج اسے دھواں دھواں سی کیوں لگ رہی ہے۔ اُسے یہ کیوں احساس ہو رہا
 ہے جیسے افروزی کی بجائے اس نے زہر پی لیا ہے۔

کم بخت نے سارا مزہ کر کر کر دیا۔ رضا کی پارٹی بھی گئی۔ کتنے دنوں بعد جانی واکر اپنے کو مل رہی تھی مگر یہ کیا ٹیلی فون بوتھ کی طرف اس کے قدم کیوں اٹھ رہے ہیں۔ آخر یہ چمکیلے شیشوں والا بوتھ کا دروازہ کس نے بھیڑ لیا ہے۔

پیسٹ جی آن ٹو جنرل ہاسٹیل پلیر

ہیلو۔ کیا مسز شوکت۔

ہاں وہ بچ نہ سکیں۔

وہ کب گھر لوٹا۔ کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ اُسے کچھ بھی یاد نہ تھا۔

دوسری صبح جب سلیم پھر آدھکا تو اسے احساس ہوا جیسے وہ اسے مار کر ہی دم لے گا۔

تم جانتے ہو۔ میں ہائی پریشن کا مریض ہوں۔

ہاں یہ تو عام بیماری ہے۔

پھر خاص بیماری کیا ہوتی ہے۔

شخصیت سے فرار۔

یہ بھی کوئی بیماری ہے۔

بیماری نہیں مرض۔ بہت پیارا اور خوبصورت جس نے تمہیں جکڑ رکھا ہے۔

تم مسز شوکت کی موت پر آزدہ ہو۔ میرے لیے ہی کافی ہے۔

کیا بک رہے ہو۔

مگر سلیم کوئی جواب دیے بغیر چلا گیا۔

یہ مرد و جب بھی آتا ہے۔ اس کا پی پی ٹرھ جاتا ہے۔ سالانہ بھی تو نہیں۔

جب وہ ایک طویل عرصے تک اس سے ملنے نہیں آیا تو اس نے پھر ایک بار اطمینان کا سانس

لیا۔ پھر کسی نے اُسے بتایا کہ وہ یہ شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ چکا ہے اُسے بھی یقین ہو گیا۔ جو آدمی

دید کا بار اٹھانے کے لیے روز اس کے گھر آتا ہوا اگر وہ تین برس کی لمبی مدت تک نہ آئے تو اس کا

مطمئن ہو جانا واجب ہی تھا۔ لیکن اس کی خوشی پر پانی پھرنے کے لیے ایک دن پھر اس نے

اس کے گھر دستک دی۔

وہ ان تین برسوں میں درابھی بدلا دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ماہ و سال کا اس پر مورخہ بھی اثر نہ ہوا ہو۔

آتے ہی اس نے حسبِ عادت طنز آمیز لہجے میں کہا۔

حیرت ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔

کیا مطلب؟، مطلب یہ کہ تمہیں اب تک مر جانا چاہیے تھا۔

تم میری جان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ مرنا اگر میرے ہاتھ میں ہوتا تو پہلے میں تمہیں مار کر مر گیا ہوتا۔

مجھے مارنے سے تمہارا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ کیوں کہ میری پیدائش خود میرے لیے ایک

حادثہ ہے۔

ٹھیک ہے لیکن تمہارے گناہوں کا کفارہ میں کیوں ادا کر دوں۔ میری بیچی کچی زندگی خود میرے لیے ایک کفارہ بن چکی ہے۔ مزید خون بہا کی مجھ میں سکت نہیں ہے۔ اس لیے تم جب بھی مجھ سے ملو تو یہ بھولو کہ میں نے انبار ل لوگوں سے ملنا تقریباً ترک کر دیا ہے۔ کیا تم میرے برتاؤ سے یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ میں تمہیں کتنے فاصلے پر رکھنا چاہتا ہوں۔

دوری اور قرب کے زہر کو میں پہلے ہی پی چکا ہوں۔ اب میرے لیے قرب اور فاصلہ دونوں برابر ہیں۔ مگر میں تو یہاں تمہیں یہ کہنے آیا تھا کہ افروز کی قبر کتبہ سے محروم ہے۔ آج تک کسی نے اس قبر پر کتبہ نصب نہیں کیا۔

یہ شکایت تمہیں اس کے شوہر سے کرنی چاہیے۔

قاتل کبھی مقتول نہیں ہوتا۔ یہ اور بات ہے کہ مقتول قاتل ہی کا ایک روپ ہے۔ ہر مقتول کے ساتھ ایک قاتل وابستہ ہے اور ہر قاتل کے ساتھ ایک مقتول۔

مجھے گنتی نہیں آتی۔

لیکن حساب بے باق اسی صورت میں ہوتا ہے جب گنتی صحیح ہو۔

شوکت نے بالکل سچ کہا تھا کہ حساب کے معاملہ میں تم ایک مارواڑی سے بھی آگے ہو۔ وہ خلافِ توقع چپ ہو کر رہ گیا۔ جب سلیم اسے روندتا ہوا چلا گیا تو اس نے منہ ہی

منہ میں ایک موٹی کالی دی۔ اور گھر سے بے ارادہ نکل پڑا۔ پھر اچانک ایک سکوتر اس کے سامنے آکر دک گئی۔ دراصل سکوتر میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی ورنہ وہ جگہ ایسی نہ تھی کہ اس نوجوان کو ہر ایک رگڑنے کی ضرورت پیش آتی۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے نوجوان کو دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

اب وہ سڑک کے آخری سرے سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

ایک عجیب کشمکش، تناؤ اور بے چینی سے دوچار اس نے سوچا۔

کوئی فلم ہی کیوں نہ دیکھ لی جائے۔ سامنے ایک سینما ہال تھا۔ دس بج چکے تھے۔ شام کا غم شروع ہو چکی تھی۔ مگر بنگلہ پر ویرانی برس رہی تھی۔ اس نے ونڈو پر پہنچ کر اسی کلاس کا ایک منٹ خرید لیا۔ سینما ہال میں اندھیرا ڈول رہا تھا۔ مگر پردے پر روشنی تھی۔ ایک خوبصورت نوجوان گھوڑے کو سر پیٹ دے رہا تھا۔ وہ ڈاکوؤں کا پیچھا کر رہا تھا۔ وہ دس منٹ اپنی سیٹ پر جما رہا۔ اندھیرا دھیر نظر پر دوڑا نہیں۔ مگر اُسے یہاں بھی بڑی گھٹن کا احساس ہوا۔

وہ سینما ہال سے باہر آ گیا۔

تارکول کی لمبی اُداس اور گونگی سڑک آج اسے ایک ویران قبرستان کی طرح لگ رہی تھی اور وہ کئی بے جان قبروں کے بیچ اپنے کندھے پر ایک بے نام کتبے کو اٹھا کر چل رہا تھا۔ !!

میں خواہ میں ہنوز

اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ وہ آدمی ابھی تک نیچے چپ چاپ کھڑا تھا۔ ابھی ابھی جب اس نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اس شہر میں اجنبی ہے اور شب ب سری کے لیے ایک رات اس کے گھر میں گزارنا چاہتا ہے لیکن اس کے انکار کے باوجود وہ ابھی تک نیچے کھڑا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ تھا۔ اس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اور وہ خود اس محلے کے لیے زیادہ آشنا نہ تھا۔ کچھ دن پہلے ہی اس نے یہاں سکونت اختیار کی تھی۔ ایسے میں شب ب سری کے لیے کسی بھی اجنبی کو جگہ دینا خطرہ مول لینے کے مترادف تھا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ سردی ہولے ہولے بڑھ رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ تیز ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ بند کھڑکیاں تیز ہوا کے دباؤ سے خود بخود کھل رہی تھیں۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے بے پاؤں کوئی طوفان آنے والا ہو۔ قریب کے کمرے میں اس کی بیوی نیند میں غرق تھی۔ کمرے کی لائٹ آف تھی اس لیے کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے اندر جا کر لائٹ آن کرنا مانتا نہیں سمجھا۔ شاید اس کی نیند خراب ہو جائے مگر اس آدمی نے اسی کے گھر کا انتخاب کیوں کیا؟ ... لیکن وہ اب تک تو چلا گیا ہوگا۔ کسی آشرم کے کمرے؟ اس کے لیے اپنی آغوش واکر دی ہوگی وہ یہ سوچ کر اطمینان سے اس درمچے کی طرف بڑھا۔ جہاں سے وہ نیچے دیکھ سکتا تھا۔

اسے کھڑکی کی طرف جاتے ہوئے دس سال لگ رہا تھا۔ وہ کب کا چلا گیا ہوگا۔ یہ بات اس نے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی۔ اور کھڑکی تک نہ جانے کا جواز اس نے اپنے طور پر ڈھونڈ لیا تھا۔ پھر یوں بھی ہوا اُنیں تیز چل رہی تھیں۔ اسے کھڑکی کے مقابل ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

بس ایک رات کی بات ہے کسی کو نے میں پڑا رہوں گا اور گہر دم چلا جاؤں گا۔ کتنی راتیں ہیں جن کی کبھی صبح نہیں ہوتی۔ مگر یہ عجیب رات ہے جو کچھوے کی طرح رنگ رہی ہے۔ وہ جی کڑا کر کے کھڑکی کے قریب آیا۔ اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ وہ ابھی تک نیچے چپ چاپ کھڑا تھا۔ سڑک پر اتنا دگّا موٹر کاریں دوڑ رہی تھیں۔ چند لوگ سمنٹ کی سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

بازار کی بیش تر دوکانیں بند ہو چکی تھیں اور سڑک پر کہیں روشنی تھی اور کہیں اندھیرا اس نے سوچا پولیس کو فون کیا جائے کہ اس کے گھر کے نیچے ایک مشتبہ آدمی کئی گھنٹوں سے کھڑا ہے۔ اُسے اپنی جان و مال کا خوف ہے..... لیکن پولیس اتنی سی بات پر تھوڑا ہی ایکشن لیتی ہے..... مگر وہ اپنے خط و خال سے بھی بھلا مانس لگتا ہے کپڑے بھی صاف ستھرے پہن رکھے ہیں۔ گفتگو میں مٹھا س اور نرمی بھی ہے..... آدمی تو کئی پر دوں میں چھپا رہتا ہے۔ جگہ نہ دینے ہی میں عقلمندی ہے۔ جگہ کے لیے تو ساری دنیا پریشاں ہے۔ شیلٹر کب کہاں اور کسے ملتا ہے۔

اب وہ کھڑکی سے ہٹ کر اپنی بیوی کے کمرے کی طرف آیا۔ اس کی بیوی ابھی تک سو رہی تھی۔ رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔ شاید گہری نیند سو کر وہ اسے یہی بات سمجھانا چاہتی ہو۔ شاید جلد سو کر وہ یہ بات بھی اس کے ذہن نشین کر دانا چاہتی ہو کہ نیند کے ساتھ ساتھ وہ اور بہت سی باتوں میں خود ڈھنسا رہے۔ مگر وہ بھی تو چپکے سے اس کے قریب جا کر سو سکتا ہے۔ جاگنے کے لیے اگر وہ آزاد ہے تو سونے کے لیے بھی اس کی آزادی برقرار رہے گی۔ وہ یوں ہی ٹہلتا رہا۔ بس کے لیے مشکل یہ تھی کہ وہ اب نہ خود سو سکتا تھا اور نہ اپنی بیوی کو جگا سکتا تھا۔

اس کا ذہن منتشر تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے گمان سر اُونچا کیے جھانک رہے تھے۔ وہ بچے کمرے میں اسی طرح ٹہلتا رہا۔ کبھی کبھار کھڑکی کی طرف اس کی نگاہیں اٹھ جاتیں تو اسے بے اختیار اس اجنبی کا خیال آتا۔ اجنبی کے خیال کے ساتھ ہی اس کی طبیعت دگرگوں ہو جاتی۔

آج اسے دو باتوں کی بڑی کوفت تھی۔ اجنبی کا خواہ مخواہ مکان کے نیچے ٹہرا رہنا۔

بیوی کا وقت سے پہلے سو جانا۔ ان دونوں نے جیسے اس کا سکھ چین چھین لیا تھا۔ اس نے دل میں سوچا اگر اجنبی اب بھی اس کے مکان کے نیچے کھڑا نظر آئے تو وہ اسے لڑائی کے لیے لڑکارے گا۔ اسے اوپر سے ایک موٹی سی گالی دے گا اور کہے گا بد معاش یہاں سے فوری دفع ہو جا۔ وہ تیز قدم ڈالتا ہوا کھڑکی کے پاس آیا۔ اس نے دیکھا وہ نوجوان اب الکلرک پول سے ٹیک لگا کر سو رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ سونے والے کو کیا گالی دی جاوے۔ رات تو آدھی ڈھل چکی ہے۔ گجر دم وہ یہاں سے چلا جاوے گا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر پھر ایک بار بغور اُسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور ہاتھ پاؤں بالکل ساکت تھے۔ شاید وہ گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر کھڑکی کے پاس ہی ٹھہرا رہا۔ شاید وہ جاگے تو اسے لڑکار سکے۔ لیکن وہ بدستور سو رہا تھا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے آہستہ آہستہ اپنی بیوی کے کمرے کی طرف آیا۔ اس کی بیوی کے کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ نیند میں غرق تھی۔ وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ اس کا ذہن اب کچھ کام کرنے کے قابل نہ تھا۔ وہ اپنے بستر پر آکر دراز ہو گیا۔ اس نے آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔

پھر یوں ہوا کہ آہستہ آہستہ اس پر نیند نے غلبہ پانا شروع کر دیا۔ اس کی مندی مندی آنکھوں میں نیند ٹھٹھٹے مٹے قطرؤں کی طرح چھنے لگی اور ایک حد ایسی آگئی کہ وہ سو گیا۔ سوئے جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔

صبح کی سفیدی درودیا اور پھیل رہی تھی۔ اٹھتے ہی سب سے پہلے اسے اس اجنبی کا خیال آیا جو رات گئے الکلرک پول سے ٹیک لگا کر سو گیا تھا۔

یک بارگی وہ بستر سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس آ پہنچا۔ اس نے دیکھا پول کے نیچے ایک مرلی سا کتا پیشاب کر رہا تھا۔

وہ جا چکا۔ چلو ایک الجھن سے نجات تو ملی۔ وہ یہ سوچ کر بڑے اطمینان سے اپنی بیوی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔ جانے کیوں اس کا سر چکر گیا۔ وہ اپنی پریشانی اور اُداسی کا جواز بھی نہ ڈھونڈھ سکا۔ چور نظر دلوں سے اس نے پھر

اپنی بیوی کو دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ غاڑہ چہرے کو کچھ عجیب طرح سے چھوڑ رہا تھا۔
کاہل آنکھوں میں پھیل کر رہ گیا تھا۔

اس نے کچھ سوچ کر سگریٹ جلایا اور اس کھر کی طرف دیکھنے لگا۔ جس سے وہ ابھی ابھی
لوٹا تھا۔ لمبا کش لے کر سگریٹ کے دھوئیں میں جھانکتے ہوئے وہ سوچتا رہا۔ کیا میں واقعی رات
سوتا رہا تھا یا پھر —

لیکن اس کی بیوی اطمینان سے سو رہی تھی !

چوتھا آدمی

اس نے اکثر سڑک کے کنارے کسی بے سہارا آدمی کی نعش کے اطراف چند آدمیوں کو دیکھا تھا جو نعش کے قریب کھڑے کفن دفن کے لیے چندہ مانگا کرتے تھے۔ کبھی کبھار یہ لوگ آنے جانے والوں کا راستہ بھی روک لیا کرتے تھے تاکہ وہ بھی اس کا ریشہیں شریک ہوں۔ مگر وہ واحد آدمی تھا جس نے اب تک اپنی جیب سے ایک پیسہ بھی نہیں دیا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ نعش کا بھی بیویاں کرتے ہیں۔

آج اسے بڑا اچھٹا ہوا کہ نعش سڑک پر نہیں تھی بلکہ ڈولے میں پڑی سڑ رہی تھی لوگ پیسے نہیں مانگ رہے تھے بلکہ انھیں ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی جو صرف کندھا دے سکے۔ ڈولے کو سہارا دینے کے لیے چار آدمیوں کی ضرورت تھی اور وہ کل ٹاکر تین خستہ حال آدمی تھے جنھیں ایک اور خستہ حال آدمی کی ضرورت تھی۔ چوتھا آدمی ایک لمحہ کے لیے ڈولے کے سامنے آکر رک گیا تو تینوں خستہ حال آدمیوں نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ ایک آدمی نے اس کے ہاتھ پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھ کر وقت پوچھا۔ اس نے جب وقت بتایا تو تینوں آدمیوں کے چہرے اُداسی سے لٹک گئے۔

”و کیا بات ہے یہ ڈولا یہاں سے کیوں نہیں اٹھتا۔“

”و ڈولے کو سہارا دینے کے لیے صرف ایک آدمی کی ضرورت ہے اور صبح سے ہمیں ایک

آدمی بھی نہیں مل رہا ہے جو اس کا ریشہیں ہمارا ساتھ دے۔“

”و قبرستان یہاں سے کتنی دور ہے۔“ چوتھے آدمی نے نڈھال لہجے میں پوچھا۔

”و یہی دو ایک میل مگر ڈولا اٹھنے پر کوئی توبل ہی جاتا ہے۔ بس کسی چوتھے آدمی

کا کندھا اگر مل جائے تو یہ نیکی کا کام یا بڑھکھل کو پہنچ سکتا ہے۔“

چوتھا آدمی شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس نے ڈولے میں جھانک کر نعش کو دیکھا۔ پھر نہ جانے اُسے کیا سوچھی۔ کیا رنگی کہہ اٹھا۔ ”وہ چلو ہم کندھا دیتے ہیں،“ بسم اللہ کہہ کر وہ تینوں خستہ حال آدمی اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔

اب وہ چاروں ڈولے کو اٹھائے سڑک پار کر رہے تھے۔ وہ مختلف گلیوں، راستوں سے گزر رہے تھے۔ جنازے کو دیکھ کر لوگ یوں بدک رہے تھے جیسے یہ کبھی مرے ہی نہیں، وہ جنازے کو تھامے مسلسل چل رہا تھا۔ اب اس کا کندھا جواب دے رہا تھا۔ وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اُسے اپنا ایک ایک قدم من من بھر دینی لگ رہا تھا اور اس کے ہاتھ اور کندھے کے درمیانی حصے میں شدید تکلیف ہو رہی تھی۔

”آخر قبرستان کب آئے گا۔“ اس نے مایوسی سے پوچھا۔

”بس ذرا اور تکلیف اٹھالیں۔“ بیک وقت تینوں آدمیوں نے جواب دیا جیسے وہ بھی

کافی تھک گئے ہوں۔“

یہ تکلیف اب اس کے لیے عذاب بنتی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ تینوں خستہ حال آدمیوں کو گالیاں دے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ دور دور تک کہیں بھی قبرستان کا پتہ نہ تھا۔ وہ سوچ رہا تھا آدمی زندہ رہ کر بھی لوگوں کے لیے عذاب رہتا ہے اور مر کر بھی اس کا بیچا نہیں چھوڑتا۔ ایک لمحہ بعد ہی اس نے منہ ہر منہ میں اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ تو یہ تو بہ آج کیسے خیالات اس کے ذہن میں آ رہے ہیں۔ راستہ کسی طرح کٹ نہیں رہا تھا۔ وہ تینوں نعش کے بوجھ کو کندھے پر اٹھائے بڑی مردہ دلی اور مایوسی کے ساتھ تھکے تھکے قدم ڈالے آگے بڑھے جا رہے تھے اب تو چاروں آدمیوں کے چہرے یوں لگ رہے تھے جیسے یہ آدمی نہیں کھوتوں کے ساعے ہوں۔ اب چوتھے آدمی یہ تھکن کچھ اتنی طاری ہو چکی تھی کہ اُسے یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ چل بھی رہا ہے یا اس کے قدم زمین ہی کے اوپر کہیں معلق ہو گئے ہوں۔ اس نے ایک گہرا سانس چھوڑتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس کے حلق سے ایک جملہ بھی نکل نہ سکا۔ تینوں خستہ حال آدمیوں نے یہ بات تاڑ لی کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن تھکن اور بھوک

اس پر کچھ اس طرح طاری ہے کہ وہ اب بات کرنے سے بھی مجبور ہے۔ صرف لمبے لمبے سانس ہی کے ذریعہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ قطع نظر اس کے ان تینوں خستہ حال آدمیوں کا بھی بھوک اور تھکن سے بہت بُرا حال تھا۔ انھیں بھی احساس ہو رہا تھا کہ نیکی اب ان کا ساتھ چھوڑ رہی ہے۔ صبر اور تحمل کی منزلیں اب معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ فرار کا کوئی راستہ نہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ ان تینوں آدمیوں میں سے کسی نے بیمار آواز میں کہا۔

”وہ دیکھو قبرستان نظر آرہا ہے۔“

چوتھے آدمی کی آنکھوں میں امید کے موبہوم حیران جھلملانے لگے لیکن وہ اب بھی شک اور یقین کے دور اپنے پر کھڑا تھا۔

اب واقعی قبرستان کی دیواریں انھیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ جب تھکے تھکے نڈھال سے قبرستان کے کیا ونڈ میں داخل ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ ان تینوں خستہ حال آدمیوں نے بسم اللہ کہہ کر جنازے کو قبرستان میں یوں رکھا جیسے وہ اب اپنا فرض ادا کر چکے ہوں۔

پھر چوتھے آدمی نے متحیر لہجے میں کہا۔

”وہاں سے بھائی یہ تو اپنا قبرستان نہیں ہے۔“

دعا

میں نے جس آدمی کو یہ رسول دیکھا۔ وہ ان دنوں پتہ نہیں کہاں غائب ہے۔ آپ نے بھی اگر اسے کہیں دیکھا ہو تو کم و بیش وہی خلش اپنے دل میں محسوس کر رہے ہوں گے جو میں نے محسوس کی ہے۔ ہو سکتا ہے میرا خیال غلط ہو۔ آپ نے اُسے دیکھا ہی نہ ہو۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے یہ ماں بھی لیا جائے کہ آپ نے اُسے دیکھا تھا۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ اُس کی شخصیت کے سارے حدود و خال آپ کے ذہن کے پردے پر اسی طرح متحرک ہوں جس طرح ابھی ابھی میں نے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ ہر شخص کی ذہنی سطح یکساں تو نہیں ہوتی کہ وہ بہتے پانی کی طرح کسی سنگ میں پہنچ کر اپنی عافیت سمجھالے۔ پھر بھی ایلنس بیس کا فرق رہے گا ہی۔ اس فرق کو نہ آپ مٹا سکیں گے اور نا میں۔ تفریق کا یہ ناگ ادل سے ہمارا پیچھا کر رہا ہے میں آج جس آدمی کے بارے میں لکھنے جا رہا ہوں۔ سمجھی میں نے بھی اس کا پیچھا کیا تھا۔ ان اسرار کو جاننے کی کوشش کی تھی جو اس کی ذات کے نہاں خانے کا ایک حصہ تھا۔ لیکن میری اس ساری کوشش کو وہ اپنے پاؤں تلے یوں دبا دیتا جیسے وہ آدمی نہ ہو کوئی قلندر یا ولی ہو یا بہت بڑا سادہ ہو۔ ہر حال وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ تھا اور بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ تھا۔

میں نے پہلی بار اُسے شاہ صاحب کے ٹیکے سے لگے ویران و خستہ حال قبرستان میں دیکھا تھا۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں شامل ہوتے ہوئے بھی الگ سا دکھائی دے رہا تھا۔

جنازے کو قبر کے منہ میں پھینک آنے کی رسم ادا کرنے کے بعد جب وہ لوگ پیچھے ہٹنے لگے تو اس نے آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ فاتحہ خوانی اور دعا کے لیے اٹھا دیے۔
اس کے ملگے ہونٹ آہستہ آہستہ یوں پھڑک رہے تھے جیسے وہ مرحوم کی بخشش کے لیے گڑگڑا کر دعا مانگ رہا ہو۔

مرنے والے کو دفن کرنے کے بعد جو گر وہ تیز قدم ناپتا قریب کی ٹوٹی ہوئی منڈیر تک پہنچ چکا تھا۔ ان میں اس کے سبھی بھائی بند تھے۔ ڈرا اور خوف کی چادر اوڑھے ہوئے ایک انجان اور نا معلوم دوسو سے میں گر قمار۔
”ارے بھئی ڈرا رکنا۔ میری آواز قبرستان کے سناٹے میں سرسرا سی گئی۔ لیکن وہ لوگ آگے بڑھتے ہی گئے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ آدمی ابھی تک فاتحہ خوانی میں مشغول تھا۔
اور اب اس گر وہ کے بیش تر لوگ قبرستان سے لگے ہوٹل میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ جیسے وہ موت کے پھندے کو گلے سے نکال کر اسے کہیں دور پھینک آئے ہوں۔ جس کھنڈر میں جہاں ابھی ابھی وہ بادید تہ تھے۔ اب ان کے ہونٹوں پر زندگی کی مسکائی تھی۔
ہو سکتا ہے جو میں نے دیکھا ہے وہ غلط ہو۔ لیکن تیسری آنکھ کبھی دھوکہ نہیں کھاتی۔
قبرستان میں کبھی ہوئی یہ ٹیڑھی میڑھی قبریں، اس پر پھولوں کی بجائے جا بجا پرندوں کی بیٹ۔ یہ بیمار اور خستہ دیواریں، صدیوں پہلے لگائے ہوئے یہ دو چار بوڑھے درخت یہ خود رو جھاڑیاں اور اس پر دینگے ہوئے یہ عجیب و غریب کپڑے۔

میں نے لوٹنے سے پہلے پھر ایک بار پلٹ کر اُسے دیکھا۔ وہ آدمی ابھی تک فاتحہ خوانی میں مشغول تھا۔ میں اس کے چہرے کو اس لیے بھی دیکھ نہیں سکتا تھا کہ اس کا چہرہ سیری نکا ہوں سے اوجھل تھا۔ صرف اس کی بیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔ اور دعا کے لیے اٹھے ہوئے اس کے دو ہاتھ۔

میں نے سوچا۔ آخر وہ کب تک اس طرح کھڑا رہے گا۔ یہ دعا دے رہا ہے یا محض مرحوم سے ہم کلام ہے۔ ایک لمحہ بعد ہی میں نے ایک سیاہ زہریلے ناگ کو جھاڑیوں میں

سے نکلتے دیکھا۔ میں وحشت سے لڑکھڑاسا گیا۔ اب میرے سامنے ناگ کی شکل میں، کھڑی تھی۔

”دیکھ لیا نا۔ ویران قبرستان میں جانے کا انجام۔ اب بھگتو ناگ کے کاٹے کا کہ علان بھی ہے۔؟ جیسے میرے اندر کے انسان نے کہا۔

”نہیں نہیں۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے بچا لو۔ مجھے بچا لو۔

میں کب اس ویرانہ سے واپس لوٹا مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں نے مُندی مُندی آواز سے باہر دیکھا۔ وہ لوگ ابھی تک ہوٹل کی کرسیوں پر ڈٹے ہوئے تھے۔

میں جیسے تیسے ہوٹل میں داخل ہوا۔ بیرے نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ تھاما۔

”وہ بالو صاحب۔ چائے یا کافی۔“

”وہ چائے اور کچھ سمو سے بھی۔“

”وہ سمو سے تو ان سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں نے ختم کر دیئے۔“

”کچھ بسکٹ تو ہوں گے ہی۔“

”وہ وہ بھی نہیں۔“

کیا وہ بسکٹ بھی وہی لوگ۔؟

”وہ خوب کھاتے ہیں صاحب۔ اسی لیے تو زندہ ہیں۔؟“

دیکھو صاحب وہ لوگ ادھر ہی دیکھ رہے ہیں۔

دیکھنے دو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

بیرہ۔۔۔ منیجر کی سرجدار آواز گونجی۔

اس میز پر کھڑا کیا کر رہا ہے۔ دیکھ وہ کنارے والا بابو کب سے چائے کے لیے پکار

رہا ہے۔ بیرہ جب بڑی شتابی سے آگے بڑھ گیا تو میں نے دیکھا۔ وہ لوگ کپڑے جھاڑ کر

یوں اٹھ کھڑے ہوئے جیسے اچانک انھیں کوئی اہم کام یاد آ گیا ہو۔ ایک ایک کر کے

ب وہ سب جا چکے تو میں نے بھی باہر نکلنے میں نجات محسوس کی۔ مگر وہ سامنے کے

یوٹری سے اپنے لیے پان بنوا رہے تھے۔ میرے ہاں سگریٹیں ختم ہو چکی تھیں۔

ہوٹل کی کسلی چائے نے جس انداز سے منہ کا مزا بگاڑا تھا۔ اس کے لیے سگریٹ کے دو چار
لیکس لگانے ضروری تھے ایک پیکٹ فوراسکوائئر۔
ابھی دیا صاحب۔ پہلے انھیں پان دسے دوں۔ اسے ہاں فوراسکوائئر تو نہیں
ہے صاحب۔

دو تو پھر جانے دو۔ آگے کہیں دیکھ لیں گے۔
دو ٹہریے۔ اگر آپ برانہ مانیں تو میں آپ کی خدمت میں فوراسکوائئر کا ایک سگریٹ
پیش کر سکتا ہوں۔ اسی گمہ وہ کے ایک نوجوان نے اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا
وہ جی نہیں۔ شکریہ۔ میں مانگے تانگے کی سگریٹ نہیں پیتا۔
وہ یہ زندگی بھی تو اُدھار مانگی ہوئی ہے۔ جس کا قرض آج نہیں توکل نہیں چکانا ہے۔
یہ تو ایک معمولی سگریٹ ہے۔ خیر۔
وہ جب آگے بڑھ گیا تو میں نے اُسے آواز دی۔ درڑ ٹہریے۔
وہ لپک کر میری طرف آیا۔ اس کے سارے ساتھی کچھ دوڑ کھڑے اس کا انتظار
کر رہے تھے۔

وہ آخر آپ مان گئے۔
وہ نہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں صرف یہ جانتا چاہتا تھا کہ وہ آدمی کون
تھا۔ جو قبر کے قریب کھڑا ہوا تھا پھیلائے فاتحہ خوانی میں مشغول تھا۔ کہیں مرنے والے سے
اس کا کوئی تازک رشتہ تو نہ تھا۔
رشتہ وشتہ کچھ بھی نہیں۔ وہ ایک دوسرے کے لیے محض اجنبی تھے۔ بالکل اجنبی۔
ہاں ہم سب اس کے قریبی عزیز تھے۔ مگر یہ سب کچھ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔
نہیں۔ وہ آدمی مجھے بڑا بھلا لگا۔ میں نے اسے ایک بار نہیں۔ کئی بار اُسے اسی عالم
میں دیکھا۔ دعا کے لیے اوپر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔
وہاں میں نے بھی کئی بار اُسے اسی قبرستان میں دیکھا۔ اور اسی روپ میں۔
وہ مجھے کسی اور جگہ کبھی دکھائی نہ دیا۔

دو ارے یاد آتا بھی ہے کہ نہیں۔ وہاں کھڑا کھڑا کیا مغز پاشی کر رہا ہے۔
 وہ وہ لوگ مجھے بلارہے ہیں۔ اب اجازت دیجئے۔ پھر کبھی ملاقات ہوگی۔
 دو کیا قبرستان ہیں۔؟
 ”یہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”مگر بھاری شہادت کون دے گا۔“

اوپر والا —

میری عجیب و غریب کھوکھلی مسکراہٹ پر وہ ہنس پڑا۔ اور اپنے ساتھیوں کیساتھ
 آگے بڑھ گیا۔

میں نے اسے دور تک جاتے دیکھا۔ جب وہ ہجوم میں غائب ہو گیا تو میں نے بھی اپنے
 گھر کی راہ لی۔

”ارے نفیس یہ کیا۔؟ تم تو گھر کی چوکھٹ پر کھڑی ہو۔ کیا کوئی خاص بات۔؟
 آج بڑی دیر لگا دی آپ نے۔ مگر یہ آپ کے چہرے کو بہو کیا گیا ہے۔ بڑے طویل
 لگ رہے ہو۔ آخر کیا بات ہے۔“

باتیں تو بعد میں ہوں گی۔ پہلے مجھے سگریٹ چاہیے۔ کہیں تم نے چھپا کر رکھ دیا ہو
 تو فوراً لا دو۔ ورنہ مجھے دوبارہ باہر جانے پڑے گا۔“

اسی طرح ٹہرے رہیے۔ میں دیکھتی ہوں۔“

کیا سگریٹ کی ڈبیہ مل گئی۔“

دیکھ تو رہی ہوں۔ کچھ تو صبر کیجئے۔“

نہیں ہیں۔ میں بھی آتا ہوں۔“

آنے کی ضرورت نہیں۔ سگریٹ مل گئی۔

سگریٹ مل گئی۔ چلو اچھا ہوا۔ نہیں تو میں مر گیا ہوتا۔“

لیجئے سگریٹ۔ اب اتنے لمبے لمبے کش لگائیے کہ گھر کے سارے کمرے دھوئیں سے
 اٹ جائیں۔ میں نے سگریٹ بھپٹ کر دو تین لمبے کش لگائے اور دھیمے لمبے میں کہا۔

آج میں بہت پریشان ہوں نفیس۔ ایک نامعلوم سا خوف ایک بے نام سی اداسی میرے
الہ دگر دگھوم رہی ہے۔ اور میں ادھر مواسا ہوا جا رہا ہوں۔

”وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔“
صرف دیکھنے سے کیا ہوتا ہے۔ نفیس مجھے تمہارا سہارا چاہیے۔ تمہارا سہارا۔
یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ آج تک کبھی مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔؟
نہیں نفیس۔ یہ بات نہیں۔ تم نہیں جانتیں۔ میں کن زہریلا ہوں سے ہو کر آیا ہوں۔

وہ سیاہ ناگ۔ وہ آدمی۔؟
خدارا۔ اب آپ آرام کیجئے۔ دیکھئے آپ کا بدن کبھی کی طرح جل رہا ہے۔
تم فکر نہ کرو۔ میں ابھی نہیں مروں گا۔ مجھے وہ سب کچھ کہنے دو۔ جو آج مجھ پر بتی ہے۔
کیا آج آفس کے منیجر سے پھر لڑائی مول لی۔؟
نہیں۔ کاش میں آفس ہی چلا گیا ہوتا۔

میں نے گھر سے نکلنے کے بعد راستے میں ایک جنازے کو دیکھا۔ ڈولے کو صرف چپ رہی
آدمی کندھے پر اٹھائے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ باقی ماندہ لوگ پیچھے تھے۔ بہت
پیچھے۔ ایک ایک کمرے کے آہستہ آہستہ غائب ہو جانے والوں میں، میں بھی ایک تھا۔ لیکن
پتہ نہیں جب میں نے اس آدمی کو دیکھا جو سفید دھاریوں والا کالا کرتہ اور ارک کا ڈھیللا
ڈھالا پا جا ماہہ پہنے مٹرک پر تنگے پاؤں چل رہا تھا۔ اس نے مجھے کچھ اس انداز سے دیکھا کہ
میں غائب ہونے والی ٹولی کی صف سے نکل کر جنازے کے آگے پیچھے چلنے لگا۔ ایسا لگتا تھا
جیسے اُس نے مجھ پر ستر کر دیا ہو۔ اب میں اس اجنبی جنازے کا ایک جزو تھا۔ جس سے میرا
کوئی خونی رشتہ نہ تھا۔ اور لوگوں کے ساتھ جب میں تکیہ والے شاہ صاحب کے قبرستان پہنچا
تو گوگرد کی تازہ مٹی کی خوشبو سونگھ رہا تھا۔ اس کے عزیزوں نے جب ڈولا قبر کے سینے پر
رکھا تو میں احترام سے ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا۔ جنازے کو قبر میں اتارنے کے بعد جن لوگوں
نے مٹی ڈالی اُن میں، میں بھی شامل تھا۔ لوگ فاتحہ پڑھنے کے بعد ایک ایک کر کے رخصت
ہو رہے تھے۔ لیکن وہ آدمی اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے ابھی تک قبر کے پاس کھڑا تھا۔

پھر ایک سربراہٹ سی میں نے محسوس کی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سیاہ ناگ پھین پھیلا میری طرف بڑھ رہا ہے۔ مجھ پر اچانک بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ جیسے کسی نے مجھے پلٹھو ڈین (PETHEDIN) کا انجکشن دے دیا ہو۔ مجھے لگا جیسے میں موت کی دہلیز پر کھڑا ہوں۔ مگر وہ ذہیر لاناگ مجھے ڈسے بغیر چھاڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔ اور موت کی دہلیز کو پھلانگتا ہوا باہر آ گیا۔ بتاؤ نفیس یہ سب کچھ کیا ہے ؟

”یہ محض تمہارا دوا ہمسہ ہے۔ تم اس جنازے میں گئے ہی نہیں۔ اور نہ تم تدفین کے وقت وہاں تھے۔“

کیا کہہ رہی ہو۔ ؟

آج تم معمول کے مطابق آفس گئے تھے۔ اور وہیں سے لوٹ رہے ہو۔ یہ ادبیات ہے کہ تم نے آج دیر زیادہ لگا دی۔“

وہ کہیں یقین نہ آئے تو آفس فون کر کے پوچھ لو۔ وہاں کوئی نہ کوئی اُور ٹائم (OVERTIME) کرنے والا لالچی آدمی ضرور ریسور اٹھاے گا۔ اور کہے گا..... لو فون کی گھنٹی بھی بجنا شروع ہو گئی۔

ارے اتنی رات گئے کون بیوقوف فون کر رہا ہو گا۔ فون کی گھنٹی کی کرخت آواز مجھے کچھ کے لگا رہی ہے۔ دوا تم دیکھ لینا۔“

درہیلو۔ جی۔ جی۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آج ان کی طبیعت نہ ساز ہونے کے سبب وہ آفس نہ آ سکے۔ کل ضرور آجائیں گے۔ اپنے منبر سے کہنا کہ نفیس نے خود بات کی تھی۔“ دو تم تو حقیقت کو بھی واہمہ سمجھنے لگی تھیں، اب ثبوت مل گیا نہ تمہیں۔ نفیس تم چپ کھول ہو۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آ رہا ہے۔“

ریپلیز۔ اب آپ سو جایے۔ صبح ساری باتیں ہوں گی۔ شب بخیر۔“

سویرے جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا۔ نفیس تخت پر بے سدھ پڑی تھی۔ اُس کے گالوں پر آنسوؤں کے چند قطرے جیسے کانپ رہے تھے۔

میں نے آگے بڑھ کر جب رومال سے اس کے گالوں پر آئے ہوئے قطرہوں کو جذب کرنے کی کوشش کی تو وہ اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دروازے دھوپ تو آنگن تک چلی آئی ہے میں آپ کے لیے پہلے چائے بنا لاتی ہوں۔ آج ناشتہ میں شاید کچھ دیر ہو جائے۔
میں نے حسبِ عادت پہلے چائے پی۔ بچے کچھ دو چار سگریٹ کھونک مارے۔ نفیس کی پیشانی کو چوما۔ اور آفس کے لیے نکل پڑا۔ لیکن دل وسوسوں سے بھرا تھا کہ کہیں وہ آدمی پھر نظر نہ آجائے۔ نظر بھی آجائے تو وہ میرا کیا بگاڑے گا۔ میں نے دل کو ڈھکا دس دی۔ دراصل میں خوف کے غول میں ابھی تک بند تھا۔

پھر اچانک وہ مجھے سامنے سے آنا دکھائی دیا۔ میرے کئی کاٹنے سے پہلے وہ سڑک پر پھیلے ہوئے ہجوم میں کہیں غائب ہو گیا۔

پھر میں نے اسے کئی بار دیکھا۔ ہر بار اسے دیکھ کر چھپنے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی رہا۔ برسوں یہ تماشہ ہوتا رہا۔ لیکن میں اندر ہی اندر جیسے ٹوٹتا جا رہا تھا۔

پھر ایک دن شاید اس کی تیسری آنکھ نے مجھے دیکھ لیا۔ ہو سکتا ہے یہ میرا دم ہو۔ لیکن یہ میرا دم نہیں تھا۔ اس نے سچ محجھے دیکھ لیا تھا۔

آج بھی وہ ایک جنازے کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ جنازے کو کاندھا دینے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ لیکن لگتا تھا جیسے یہ جنازہ کسی غریب یتیم اور سیرکا ہو۔

میں ایک غیر مری طاقت کے زیر اثر جنازے کے ساتھ اور لوگوں کی طرح چلنے لگا۔ کبھی آگے۔ کبھی پیچھے۔

لوگ جنازے کو قبر کے منہ میں پھینک کر چلے گئے۔ لیکن وہ آدمی بدستور قبر کے قریب کھڑا ہاتھ پھیلائے دُعا مانگ رہا تھا۔

میں نے اضطرابی کیفیت سے ادھر ادھر دیکھا۔ اور دبے پاؤں اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اب میرے دونوں ہاتھ آسمان کی آواٹھے ہوئے تھے۔ غیر ارادی طور پر جب اس کے بازوؤں سے ٹکرا گیا تو اس نے وحشت ناک نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

اتنی لمبی دعا مانگنے کا حق تجھے کس نے دیا۔ بول۔ چپ کیوں ہے۔ کیا تو مجھ سے بازی لے جانا چاہتا ہے۔

ویران قبرستان کے دورہ دورہ میں اس کی آواز یوں گونج رہی تھی جیسے وہ لمبے کی چیخ ہو۔ قبرستان کے سینے پر ریگنے والے سارے کیڑے مکوڑے اچھل اچھل کر گر رہے تھے یا مردہ تھے۔ آسمان پر کالے کلوٹے کوؤں کی کائیں کائیں سے زمین بھٹی جا رہی تھی۔ وہ مسلسل چیختا جا رہا تھا۔ اتنی لمبی دعا مانگنے کا یہ حق تجھے کس نے دیا۔ بول۔ بولنا کیوں نہیں۔ کیا زبان پر تالے پڑ گئے ہیں۔ سن نہیں رہا ہے مردود۔

میں خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ زہر لاناگ میرے جسم میں آہستہ آہستہ زہر کی بوتلیں اُنڈیل رہا ہو۔ مجھ پر ایک غنودگی سی طاری تھی۔ ایک عجیب سی غنودگی۔

پھر وہ اچانک مجھ پر چھپٹ پڑا۔ جیسے وہ آدمی نہیں جنگل کا کوئی خونخوار شیر ہو۔ دفعتاً اس نے میرے اوپر اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا۔ اس کے سیاہ ملگے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ریگ گئی۔

جا۔ میں نے مجھے معاف کیا۔ پھر اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلا دیے۔ جیسے وہ خدا سے پھر ایک بار کچھ مانگ رہا ہو۔

مردہ گاڑی

مردہ گاڑی کے اطراف لوگوں کا اڈدھام تھا۔ ہسپتال کی سیڑھیوں پر بے شمار لوگ اور بھی تھے جو فحش کی والیسی کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ایک بڑے بڑے بالوں والا نوجوان پٹی بھٹی آنکھوں سے کبھی مردہ گاڑی کو اور کبھی دو اخانے کے سینے پر پھیلے ہوئے بھانت بھانت کے چہرؤں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی مووی فلم کا آخری سٹارٹ دیکھ رہا ہو۔ وہ بظاہر مجھ سے الگ ہوتے ہوئے بھی مجھ ہی کا ایک فرد نگ رہا تھا۔

دو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ اسے کیوں دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں جب کہ وہ انسانی پھڑپھڑوں کے نیچے آنا نہیں چاہتا۔،،

کیا بک رہے ہو۔ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے قہر آلود نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ نوجوان نے اس کی بات کی ذرا بھی پروا نہ کی اور گلے میں لٹکے ہوئے کیمرے کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے اس نے دوبارہ اپنے ادھورے جلے کوپورا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنا پوسٹ مارٹم کروا لیا ہے اس لیے میرا خیال ہے کہ اس کا خاموش اور ٹھنڈا جسم اب مزید کسی جراحت کا متحمل نہیں ہو گا۔،، مگر کسی نے بھی اس کے کہے ہوئے جلے پر دھیان نہیں دیا۔ دفعتاً اوپر کی منزل کے پہلے سرے پر سفید لباس میں ملبوس ایک ٹیالے رنگ کا چہرہ ابھرا۔

لوگ چیخ پڑے ہیں ہے وہ ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے سب کے چہرے پر ایک ایشی نگاہ ڈالی۔

بھائیو آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں گو معذرت

کبھی کبھی شرافت کے آگے ڈھال بن جاتی ہے۔ روشنی اور تاریکی میں لپٹا ہوا آدمی جب مردہ گاڑی کے تختے پر لیٹ جاتا ہے تو اسے شور پسند نہیں آتا۔ وہ ابدی خاموشی کے آگے سرنگوں ہو جاتا ہے اور یہیں سے اس کی زندگی کا ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں دھرتی کے افق سے طلوع ہونے والے اس سورج کے انتظار میں اگر آنکھیں بند کر لی جائیں تو یہ ہماری بڑی ٹریجڈی ہوگی۔

اس پروفیسر کے بچے کو یہاں سے ہٹاؤ۔

ہیں ڈاکٹر جیسیے۔

اور ڈیڈ باڈی۔ ؟

یہ تو ہمارا بنیادی مطالبہ ہے۔

مختلف آوازوں کے ہجوم میں۔ اب ڈاکٹر کی آواز کسی کو سنائی نہیں دے رہی تھی اب ادھر ادھر کے لوگ بھی اس مجمع میں شامل ہو گئے تھے۔ انھیں حقیقی صورت حال کا کچھ پتہ نہ تھا۔ لیکن وہ بھی آوازیں آواز ملانے کی کوشش کر رہے تھے نیچے لان میں چند لوگ لیٹے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا جیسے وہ اس دھرتی کے باشندہ نہ ہوں کوئی اور مخلوق ہو۔

لوگ زندگی کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اتنے باولے ہو چکے ہیں اب صرف مردہ گاڑی ان کی توجہ کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اور یہ ایک ڈیڈ باڈی کے لیے اتنا شور،،

نہیں یا اریسا لگتا ہے کہ یہ تمام زندانی ہیں جو یہ نہیں چاہتے کہ کوئی بھلا مانس اس دم ٹھٹھے ہوئے ماحول سے نکل کر کھلی ہوا میں سانس لے۔،،

مردہ گاڑی ہی ہماری زندگی کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ ہمارے چہروں کی شناخت ہی آج کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ اوپر کی منزل پر پہلے ہوئے چہرے اس ڈاکٹر کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں جس کا ایک پاؤں خود مردہ گاڑی میں پھنسا ہوا ہے مگر زندگی کے کٹھڑے میں کھڑا ہو کر کوئی گواہ بننا بھی پسند نہیں کرتا۔،،

گواہ ہیں نبول گا۔ لان میں لیٹا ہوا وہ نوجوان جس نے چپ کی چادر اور دھرتی تھی

اونچی آواز میں کہا۔

بہت دیر میں ہی اس نے کام کی ایک بات تو کی۔۔

مگر گواہ بننے میں ایک قباحت بھی تو ہے کیوں کہ گواہی شیطانی چہرے کی وہ لکیر ہے جو سچ سے بول میں شامل ہو کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتی ہے۔ اگر مجھے منوں مٹی کے بیچے سے کوئی نکال کر یہ کہے کہ بھائی کیا تم میرے گواہ بنو گے تو میں سر اسرا کر دکھ دوں گا اور کہوں گا کہ میری نیند برباد نہ کرو۔

مگر گہری نیند سے بیدار ہونا بھی کیا ن ایک منزل ہے۔

تم منزل کی بات کر رہے ہو میں اس زینے کی بات کر رہا ہوں جہاں مردہ گاڑی میں ایک شخص خاموش لیٹا ہوا ہے۔ مجھے تو وہ ڈاکٹر اچھا لگ رہا ہے جس کے حلق سے بھانت بھانت کی بولیاں پھڑک رہی ہیں دیکھ رہے ہو اسکا سانس بھی پھول رہا ہے۔ مگر وہ چٹائی کی طرح جا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس ٹیلے کے بیچے پھیلے ہوئے انسانوں کو اس نے دیکھ لیا ہے۔ ہو سکتا ہے میں ہی دیکھا ہو۔ یہ جملہ اس نوجوان نے کہا۔ جو زندگی کے زندان کا آخری گواہ تھا۔ یا گواہی کا طوق ڈالنے کے لیے تیار تھا۔

میں ضرور گواہی دوں گا۔ اس نے ایک بار پھر اس طرح کہا جیسے وہ اپنی بات منوانا چاہتا ہو۔ تم بہاری آزادی میں فخل ہونا نہیں چاہتے تینوں نے بیک زبان ہو کر کہا۔

مگر اس کے بعد تم ہم سے بچھ جاؤ گے ؟

میں پھر کبھی تمہیں تلاش کر لوں گا۔

کیسے اور کس طرح ؟ ہم تو کبھی ایک جگہ جم کر نہیں رہتے یہ تو تم بھی جانتے ہو۔

زندگی کے آخری سرے پر پاؤں رکھنے سے پہلے تم میں سے ایک آدمی بھی مجھے مل جائے

تو میں سمجھ لوں گا کہ میری ملاقات تم سب سے ہو چکی ہے۔

لیکن تم اپنے آپ سے کب ملو گے۔ تم تو زندان میں پھڑپھڑانے والی زندگی کے ایک

ادنیٰ گواہ ہو۔ ان چاروں آدمیوں میں سے ایک نے قدرے تحیر آمیز انداز میں کہا وہ جیسے اس

جملہ کو پی گیا۔ تمہیں وہ کنواں یاد ہے جہاں ہم چاروں نے ایک ساتھ چھلانگ لگائی تھی مگر پھر بھی

پچ گئے۔ تم ایک کنویں کی بات کر رہے ہو میرے ذہن میں ہزاروں کنویں ہیں جہاں ہم نے۔ لیکن بات جب پچھڑنے کی آگئی ہے تو ایک کنویں اور ہزار کنویں سے کوئی فرق نہیں پڑتا موت ایک اٹل حقیقت ہے زندگی کی جھوٹی گواہی ہی دراصل زندگی کی سب سے بڑی تحقیر ہے مگر تحقیر کے اس زہر کو تم کھینا ہی چاہتے ہو تو ہم تمہیں روکنے سے کہتے ہیں۔ ہاں میں ہاں ملانا ہی انسان کی سب سے بڑی تحقیر ہے اب تم لوگ میری نظروں سے گر چکے ہو۔ نوجوان نے اپنے ساتھیوں کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے حتیٰ انداز میں کہا۔

اپنی آوازیں کوئی اور سُر داخل ہو جائے تو سُر کی پہچان ناممکن بن جاتی ہے میں سمجھتا ہوں یہ نوجوان جو کچھ کہہ رہا ہے وہ ٹھیک ہے۔ میں بھی شاید تم میں باقی نہ رہوں۔ اس حلقے سے دو آدمیوں کا اس طرح نکل جانا انھیں کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اکائی میں طاقت ہے ایک آوازاں بھری مگر کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

پھر ایک موہوم سی قد اور قضا میں ارتعاش پیدا کر گئی۔

اب میں تنہا رہ گیا ہوں یکہ و تنہا دور دور تک کوئی نہیں۔ مگر دو اخانے کی سیڑھیوں پر برآمدے پر ابھی تک وہی اثر دھام ہے۔ لوگ چلا رہے ہیں

نفس واپس کرو۔ نفس واپس کرو۔ ورنہ ہم دو اخانہ کو آگ لگا دیں گے۔ ہم ہسپتال کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ برآمدے میں ڈاکٹر ابھی تک کھڑا ہے اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ رقصاں ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ اس بنیادی مطالعہ کی تہہ تک پہنچ چکا ہے دوسرے ہی لمحہ اس کے ہونٹ اس طرح ہل رہے جیسے کوئی بہت بڑا دھماکہ ہونے والا ہو۔ ڈاکٹر نے اطمینان کے لہجے میں کہا۔ تم لوگ مردہ گاڑی سے نفس لے جا سکتے ہو۔

سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نفس کے ساتھ انھیں ایک بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔

اب لوگوں کے قدم مردہ گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے۔
 ٹھہر بھاٹیو میں ایک بات اور تم سے کہنا چاہتا ہوں۔ جس نفس کو تم مردہ گاڑی سے کھینچ لے جانا چاہتے ہو وہ مرا نہیں زندہ ہے۔

ہجوم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ سب چپ چاپ ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ پانچ
 منٹ — دس منٹ — پندرہ منٹ — مردہ گاڑی کے اطراف اب کوئی نہیں تھا۔
 لوگ آہستہ آہستہ دو خانے کی سیڑھیاں پھیلانگ رہے تھے۔ یکبارگی اُس لالچے لالچے بالوں
 والے نوجوان نے مردہ گاڑی کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔
 ڈاکٹر اسے مجھے دے دو۔ ۵

ایک از ہر ملی کہانی

اُس نے ابھی گھر کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اس کی بیوی نے گھراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔ آج مننا پھر گھر سے غائب ہو گیا ہے۔

اُسے یقین تھا کہ اس خبر کو سننے کے بعد اس کا شوہر اُسے کافی ڈانٹ پلائے گا کم از کم لٹے پاؤں ہی گھر سے اُسے ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑے گا۔ مگر خلاف توقع وہ بڑے اطمینان سے گھر میں داخل ہوا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد کپڑے تبدیل کیے اور اپنی بیوی سے چائے کی ایک پیالی کی فرمائش کی۔ اس دوران اس کی بیوی نے جو کچھ کہا۔ وہ اسے محض سنتا رہا۔ اپنے شوہر کو اطمینان سے چائے پیتا ہوا دیکھ کر اُسے حیرانی ہوئی۔ یہ حیرانی اس وقت اور بڑھ گئی جب اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر چائے پینے کے بعد اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا ہے۔ اُسے ایک ثانیہ کے لیے یہ سب کچھ عجیب سا لگا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ آدمی اس کا شوہر بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس خبر کو سننے کے بعد اس نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا ہو۔ یادہ یہ بھی سمجھ رہا ہو کہ منادھر ادھر بھٹک کر کسی طرح گھر آجائے گا۔ وہ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبی اپنے آپ کو ایک ایسی بے بس عورت سمجھ رہی تھی جس کا آخری رہاؤ بھی ٹوٹ چکا ہو۔

اچانک کسی نے اُس کے گھر پر دستک دی۔

وہ باہر کوئی آواز دے رہا ہے۔ اس کی بیوی نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ جو اخبار پڑھتے ہیں کچھ اتنا منہمک تھا کہ اُسے اپنی بیوی کی آواز بھی اب پرانی سی لگ رہی

تھی۔

”وہ ہو سکتا ہے کوئی مُنہ کو لے آیا ہو۔ یا خود مُنہ نے گھر پر دستک دی ہو۔“
 وہ اپنے گھر پر خود منہا دستک دے کیا کہہ رہی ہو۔ منہا اگر ہوتا تو دروازے ہی میں سے
 بیچ اٹھتا۔ ”دروازہ کھولئے۔“

اس نے اطمینان سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔
 ”ارے الطاف تم۔؟ اس نے خوشی سے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

”کب آئے۔“

”آج ہی۔“

”اندرا جاؤ یا ر۔“

اس کی بیوی نے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ ”اس کم بخت کو بھی آج ہی
 آنا تھا۔ اب پھر چائے کا دور چلے گا۔ اور ہوا بھی وہی۔ اس نے چائے کے لیے ہانک
 دیکھی اس کی بیوی نے چائے کی کیتلی کو بڑی بیزاری سے چولہے پر رکھا۔ اور وہیں سو جتی
 کھڑی ہو گئی۔

چائے کی پیالیوں کی آواز سن کر اس کے شوہر نے اندر بارورچی خانے میں آکر کہا۔
 رات کے کھانے پر میں اُسے روک رہا ہوں۔ دو ایک ڈھنگ کے ساکن تیار کر لیتا۔
 اس کی بیوی نے زہر آلود نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ کچھ کہے بغیر چائے
 کی کشتی ہاتھ میں تھامے ڈرائینگ روم میں آکر اپنے ساتھی سے گئیں ہانکنے لگا۔
 بڑی عمدہ چائے بنائی ہے بھابی نے۔ اُس کا ساتھی کہہ رہا تھا۔

وہ شاید نشانہ غلط لگ گیا۔ ورنہ ایک آنچ کی کسر ہمیشہ باقی رہتی ہے۔
 ایسا لگتا ہے کینٹین کی گاڑی اور بد مزہ چائے پیتے پیتے تمہارے منہ کا مزہ بدل گیا ہے
 وہ یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ اس کا سارا دھیان مُنہ ہی کی طرف تھا۔ وہ سوچ
 رہی تھی اس کا شوہر کتنا بے حس ہے۔ اپنے ساتھی کو رات کے کھانے کی دعوت دے رہا
 ہے۔ جب کہ مُنہ۔۔۔

وہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔

” میں نے ابھی ابھی کسی کے رونے کی آواز سنی۔ بھابی تو ٹھیک ہے نا۔“

اس کا ساتھ ہی کہہ رہا تھا۔

” بالکل ٹھیک ہے۔“

” اور مٹنا —؟“

وہ ہٹاؤ یا رمنے کے ذکر کو۔ بات چیت کے لیے کوئی اور موضوع نہیں ہے تمہارے پاس۔

اسے امید نہیں تھی کہ اس کا ساتھ ہی بے اعتنائی کی اس سطح پر اتر آئے گا۔

اب اس کی باتوں میں وہ گہری نہ تھی۔ پھر بھی وہ ایسے تیسے باتیں کیے جا رہا تھا۔ لیکن

اس کا سارا دھیان بٹا ہوا تھا۔

جیسے جس آدمی مرتا بھی تو نہیں —، ” اندر سے ایک غصیلی آواز ابھری۔

وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کچھ دیگر ہے۔ وہ اپنے ایک قریبی یار سے کچھ چھپا رہا ہے۔ یہ

آواز بھابی کے علاوہ کس کی ہو سکتی ہے۔ مگر وہ تو اس کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔

آخر یہ کس قماش کا آدمی ہے۔ نہ اُسے اپنی بیوی سے پیار ہے اور نہ بچے سے۔

وہ پہلے تو ایسا نہ تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں۔ آج اس نے بیوی سے لڑائی کی ہو۔

یا بچے کو کافی پٹیا ہو۔

تمہیں آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا ہوگا۔“ وہ اپنے ساتھ سے اس طرح

کہہ رہا تھا جیسے وہ کھانے بغیر چلا جائے گا تو وہ کھجور کا رہ جائے گا۔

اس نے حامی بھر لی تو وہ خوش ہو گیا۔

مگر بھابی کو خواہ مخواہ تکلیف ہوگی۔“

عورت تکلیف اٹھانے کے لیے ہی پیدا ہوئی ہے۔“

یہ جواب بھی اُس کے لیے کچھ غیر متوقع تھا۔

وہ کیا یہ ممکن نہیں کہ بھابی بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔؟

وہ تمہاری بھابی نے سب سے ملنا جلنا ترک کر دیا ہے۔ وہ کھانے پر نہیں آئے گی۔

اب اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ فرحت و طمانیت اٹھ چکی ہے جو کبھی اس نے اس گھر میں دیکھی تھی۔

دفعۃً اندر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”شاید کھانا تیار ہو گیا ہو۔ یہ کھانے کی تیاری کا ہی الارم ہو سکتا ہے۔“

وہ اندر چلا گیا۔

کھانا تو میں نے تیار کر دیا ہے۔ مگر منے کو بھی ضرور بلو الینا۔ پتہ نہیں وہ کہاں بھوکا ٹرہا ہو گا۔ ”یہ اس کی بیوی کی آواز تھی۔“

جب وہ کھانے کی کشتی لے کر اندر آیا تو وہ کچھ بچھا بچھا سا لگ رہا تھا۔ ابھی اس نے ٹیبل پر کھانا چنا ہی تھا کہ اس کے کانوں سے پھر ایک بار آواز نکل گئی۔

”بے حس آدمی مرنے کا بھی تو نہیں۔“

کیا تم بتا سکتے ہو وہ بے حس آدمی کون ہے جو مرنے کا بھی نہیں کہیں وہ میں تو نہیں

ہوں۔

مگر بھابی !!“

ہاں جب سے مٹا مرا ہے وہ اسی طرح باتیں کرتی ہے۔!

استری

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض لوگ ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے ہی کو دوستی کا پہلا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ وہ آخری ذریعے تک پہنچ بھی پاتے ہیں یا نہیں یہ کوئی نہیں جانتا۔ دستگیران ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔ فراخ ماتھا، چھوٹی چھوٹی کمر بچی آنکھیں سانولا سلونارنگ۔ آنکھوں پر چڑھا ہوا کالا سیاہ چشمہ۔ وہ اس وضع قطع سے کوئی اور ہی ملک کے باشندے لگتے۔ سارے محلے کو لوگ انہیں دستگیر چا کہتے تھے جب بوڑھے لوگوں نے بھی انہیں چا کہنا شروع کر دیا تو انہوں نے اپنی دائرہ بیڑھا اُن کا ایک چھوٹا سا کاروبار تھا۔ وہ الیکٹرک لک سامان کے واحد تاجر تھے جنہیں محلے کا ہر چھوٹا بڑا آدمی جانتا تھا۔

مجھے استری خریدنی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح بات ٹلتی جا رہی تھی۔

ایک دن راستے میں ان سے بڑبھڑ ہو گئی۔ سلام کے لیے ہاتھ توان کا پہلے ہی اٹھ چکا تھا اب صرف مسکراہٹ بکھیرنا باقی رہ گیا تھا۔

”کوئی خاص بات ضرور ہے جو تم مجھ سے ملنے آئے ہو۔“

”وہ راستے میں اگر اچانک یوں بڑبھڑ ہو جائے تو کیا اسے ملنا کہیں گے۔“

”وہ یہ تو اپنی سوچ اور سمجھ کی بات ہے۔ تاہم پھر بھی۔“

بات یہ ہے کہ مجھے ایک استری خریدنی ہے وہ دوڑھائی سو روپے تک تم نے استری کو اتنا سستا سمجھ لیا ہے۔ اور اس کی قیمت بھی لگادی۔

خیر اگلے نکلے پر میری دوکان ہے وہ تمہیں وہاں مل جائے گی۔

جب اگلے ننگ پر پہنچ کر انہوں نے اپنی دکان کھولی وہاں میں نے دیکھا بھانت بھانت کے چھوٹے موٹے سامان کا ایک ڈھیر تھا۔ اسی ڈھیر میں مجھے استری بھی نظر آئی۔

”دیکھو بھئی یہ رہی اپنی دکان۔ اور یہ رہی تمہاری استری۔“

میں نے الٹ پلٹ کر استری دیکھی۔ وہ مجھے بیک نظر پسند آگئی۔

سوچ رہا تھا مول تول کروں تو بات بن بھی سکتی ہے اور بیک بھی سستی ہے۔

اس لیے میں نے قیمت اُن ہی پر چھوڑ دی۔

”لے لیجئے۔ آپ سے کیا مول تول۔“

”پھر بھی۔“

کیا چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد رکھتے ہو یا پہلے یہ بتاؤ کیا تم نے سارنگ پور ہمیشہ

کے لیے چھوڑ دیا ہے۔“

ایسا تو نہیں مگر بھئی کی مہانگری میں ٹامک ٹوپی سے ضرور مار رہا ہوں۔

اشرف تم نے سارنگ پور چھوڑ کر بڑی غلطی کی ایک تو خاصی بھلی نوکری جاتی رہی۔

دوسرے وہاں قدم قدم پر ایکس پلائی ٹیشن کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو گا۔ ایکس پلائی ٹیشن

کہاں نہیں ہے۔ ہر جگہ ہے۔“

کم از کم تم اپنی ماں کی خاطر بھئی چھوڑ کر سارنگ پور آ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔

وہ ماں کی خاطر۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ میرے جانے کے بعد ہی اچانک

جیل بسیں۔ اب مجھے پُرسہ نہ دو۔ مجھے ہمدردی جتانے والوں سے ایک گھن سی آتی

ہے۔ تم میرے ایک اچھے دوست ہو۔ یقین ہے تم میری اس بات کا جبراً نہیں مانو گے

جنید کہیں یاد ہے میرا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔ آج کل وہ دبئی میں ہے۔ اس کیلئے

نے ہمیں ایک لخت بھلا دیا۔

میں نے اُسے ماں کی علالت کی اطلاع دی تو پتہ ہے اس نے کیا کہا۔

وہ بیماری بوڑھوں کا مقدمہ ہے۔“

پھر جب میں نے ماں کی موت کا اُسے ٹیلیگرام بھیجا تو اس نے دو سطر ہی میں مجھے

دیا۔

موت برحق ہے۔ دلیسے میں نے یہاں فاتحہ خوانی کا انتظام کروا دیا ہے۔ براہ کرم
محبت کا یہمانہ نہ بنائے۔ میں ہمیشہ یہاں مصروف رہتا ہوں۔“

اس کے بعد نہ میں نے اسے خط لکھا اور نہ اس نے۔ اب میں نے اُس کیلئے کو
ہی بھلا دیا ہے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے سن کر کیا کہو گے۔ سوچ رہا ہوں ریڈی
منش کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لوں۔ بھنڈی بازار میں ایک جگہ بھی دیکھ لی ہے
ٹ پاتھ تو ہے ہی۔ اس دلیل نے اگر چاہا ہوتا تو میں یہاں یوں دھکے نہ کھاتا۔ شیر
کار ساز ہے۔ کچھ نہ کچھ تو سبیل نکل ہی آئے گی۔ اب سناؤ تمہارا کیا حال ہے۔ کیا
ناکیسپورٹ اور امپورٹ والا چکر۔“

جب بیٹھ چھٹی تو پتہ چلا کہ جینا بازار میں جو ہم دھماکے ہوئے وہ دو مخصوص میاں
کا کارنامہ تھا۔ انہوں نے اپنی ماؤں بہنوں کا بدلہ چکایا تھا۔
ہر حال جتنے منہ اتنی باتیں۔

نر صدیق بھائی کو کیوں گولی مار دی گئی۔ اُسی گولی سے وہ شکر کو بھی مار سکتے تھے
نہن آدمی تھا۔

شکر کو گولی مارنے کا مطلب تم سمجھتے ہو۔؟
سمجھتا ہوں۔

ب بڑا فرقہ دارانہ فساد

اتم ہی چاہتے ہو۔؟

ن فساد چاہتا ہے۔ عام لوگ تو صرف امن چاہتے ہیں۔

شکر کو گولی نہ مارو۔

ا کا مطلب ہے کہ وہ بلا ضرورت گولیاں چلاتا رہے اور ہم لوگ تماشہ دیکھتے

ضرورت پڑنے پر چوریاں بھی پہن لیں۔

صدیق بھائی کی میت میں وہاں نہیں چلو گے۔“

وہ نہیں وہاں کرفیو ہے۔ وہاں جانے کی اجازت ان ہی لوگوں کو مل سکتی ہے جو ان کے قریبی عزیز ہوں۔ پھر یہ جھوٹی گواہی کون دے گا کہ ہم ان کے قریبی عزیز ہیں۔ پھر یوں بھی میرا ان سے کیا تعلق۔؟ روز کوئی نہ کوئی صدیق بھائی مرنے ہی ہے۔ گو گڑ بڑ ختم ہو چکی ہے مگر نہ جانے یہ احساس مجھے کیوں ہو رہا ہے جیسے گڑ بڑ پھر شروع ہو جائے گی۔
”وہ بہتر ہی ہے کہ تم یہ استری نہیں رکھ دو۔ حالات ٹھیک ہونے پر لے جانا۔

لیکن میں نے دستگیر صاحب کی بات نہیں مانی۔

پھر راستے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ کرفیو اب لگنے ہی والا ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھر وں کو واپس ہو جائیں۔“

لوگ دھڑا دھڑا سہمے سہمے مختلف راستوں سے گزر رہے تھے۔ تنگ راستوں اور گلیوں سے گزرنے والوں کے چہرے عجیب تھے۔

جب میں نے گلی سے ٹکر کر شاہراہ پہنچا تو ایک پولیس والے نے مجھے آگے جانے سے روک دیا۔ میں نے جب اس سے احتجاج کیا تو اس سے گرجا ر آواز میں پوچھا یہ ہاتھ میں کیا ہے؟

”استری۔ جو ابھی ابھی میں نے دو سو روپے میں خریدی ہے۔“

ظاہر ہے استری میں واٹر بھی ہوں گے۔

ہاں ایک دو تو رہتے ہی ہیں۔

واٹر موٹے ہیں یا پتلے۔؟

دونوں۔

پھر تو معاملہ اور بھی سنگین ہے۔ تمہیں تھانے چلنا ہو گا۔

کس جہم میں۔؟

”وہ یہ وہیں پتہ چلے گا۔“

چھٹکارہ کا کوئی راستہ۔

ایک ہی۔ تم یہ استری میرے حق میں چھوڑ دو۔ یہ استری میں نے دستگیر بھائی پاس دیکھی تھی۔

کیا تم دستگیر بھائی کو جانتے ہو۔؟

ہاں دستگیر بھائی کو بھی اور گرجا شکر کو بھی۔

یہ گرجا شکر اچانک کہاں سے آدھمکا۔۔۔ تم اُسے کیوں گہ فتار نہیں کرتے۔

وہ اپنے پیچھے کوئی ثبوت نہیں چھوڑتا۔ اس لیے ہر بار بڑی صفائی سے بچ نکلتا ہے۔ تم بھی وہی تکنیک استعمال کر سکتے ہو۔

میں نے اس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دراز دس کے دونوں اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

اس نے اپنے ہاتھوں کو جھٹکا دے کر یوں ہٹا لیا جیسے وہ نوٹ نہ ہوں کوئی خطرناک پتھو ہوں۔

مجھے پتہ نہیں استری چاہیئے۔

مگر یہ استری ہی کیوں؟ تم کوئی دوسری استری بھی تولے سکتے ہو۔

لے تو سکتا ہوں۔ مگر۔ اس پر وہ لکھا نہ ہوگا۔

اس پر تو کچھ بھی لکھا نہیں ہے۔

غور سے دیکھو ہے۔ باریک حروف میں اوم۔ سیدھی جانب

میں نے دوبارہ استری کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کہیں بھی اوم کے شبہ نہیں تھے۔

عجیب بات ہے تم لوگ اپنے خدا کو تو دیکھ لیتے ہو مگر تمہیں دوسروں کا بھگوان دکھائی نہیں دیتا۔ شاید آج کے جھگڑے کی ہی وجہ ہو۔

میں نے مزید کچھ سوچے بغیر اُسے استری دے دی۔

اس نے مجھے کیا دیا یہ نہ پوچھئے! اور کل کا اخبار ضرور دیکھئے کیا پتہ یہ استری کل کونسا

روپ دھار لے...!!

گریباں گیر

برسوں بعد میں نے اُسے شہر کے ایک معمولی ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ سوچا کہ دو گھنٹی اسے روک کر بات کر لوں اور پوچھوں ارے یارا! بارہ برسوں میں تم نے کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ شادی بھی کی یا ابھی تک لٹوڑے ہی رہے۔ اگر شادی کی تو آبادی میں کس حد تک اضافہ کیا۔ ضروری اور غیر ضروری سب ہی باتیں۔ لیکن جذبے میں کوئی ایسی شدت نہ تھی کہ اس سے کم از کم اس کی خیریت ہی پوچھ بیٹھنا۔ یوں بھی بڑک کی دھکم پیل سے طبیعت ادب سی گئی تھی۔ جس بس سے اسے گھر لوٹنا تھا، اس کے آنے میں ابھی کافی دیر تھی۔ اس لیے اس نے آٹو رکشا کو ترجیح دی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ گھر پہنچ گیا۔ گھر کا دروازہ خلاف معمول کھلا تھا، اس نے دلیز پر پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ اس کے کانوں سے ایک آواز نکلرائی۔ اتنے دنوں بعد آپ آئے ہیں تو بغیر کھانا کھائے ہیں آپ کو جانے نہ دوں گی۔ ایک آدھ گھنٹہ مزید آپ انتظار کر لیں تو وہ آہی جائیں گے۔ لیجئے وہ آگئے۔

تسلیمات۔ جلیے رہو۔ اور خوش رہو۔

آپ نے اپنے آنے کی کوئی خبر نہیں دی ورنہ اسٹیشن ضرور آتا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ خط لکھنا مجھے کتنا فضول سا فعل لگتا ہے۔ شاید اسی سبب میرے احباب مجھ سے ہمیشہ شاکی رہے۔ اور ایک ایک کر کے جدا بھی ہو گئے۔ اچھا آصف میاں چھوڑ والے باتوں کو۔ تمہاری صحت تو ٹھیک ٹھاک ہے نا۔

ٹھیک ہی سمجھ لیجئے۔

تمہارے اس جملہ ہی سے ظاہر ہو رہا ہے کہ بیماری سے تم نے ابھی تک چھڑکارہ حاصل نہیں کیا۔ مجھے دیکھو قریب قریب سا ٹھکے پٹے میں پہنچ چکا ہوں۔ کیا حبال کہ کوئی بیماری میرے قریب آئے۔

اس کے خسر نے اپنی صحت کے بارے میں ابھی ابھی جو بات کہی تھی وہ کچھ غلط نہ تھی۔ لیکن پتہ نہیں اُسے یہ کیوں احساس ہو رہا تھا جیسے باتوں ہی باتوں میں انہوں نے اس کی صحت کی تضحیک کر دی ہو۔ تندرستی ہزار نعمت سہی لیکن بڑے میاں کو یہ حتیٰ کس نے دیا کہ وہ نوجوانوں کی توہین کرے۔ نہیں نہیں یہ شخص اس کی بدگمانی ہے وہ تو ایک بڑے شریف آدمی ہیں۔

اسی دوران چائے کی دو پیالیاں لیے اس کی بیوی نے قریب آکر کہا۔ لیجئے آپ بہت تھکے ماندے لگ رہے ہیں۔ گرم چائے پی لیجئے۔ اس سے تھکن دور ہو جائے گی۔ جب اس کے ابا نے تیزی سے چائے پی لی تو اس نے کہا۔ کیا ابا جی ایک اور کپ لادوں۔ میں بیک وقت دو سے زیادہ کپ چائے نہیں پیتا۔ اچھا اب اجازت دو بیٹا۔ لالہ رام بھی میرے ساتھ ہی لوٹیں گے۔

ان کے ہاں کار جو ہے۔

چلے سفر اچھا گزرے گا۔ ہم سفر جو اچھا بڑا۔ پھر خدا حافظ کی آواز دور تک گونجتی رہی۔

جب وہ چلے گئے تو اس کی بیوی نے کہا۔ پتہ نہیں ابا جی آپ کی صحت کے بارے میں اتنے مشکوک کیوں ہو گئے۔ حالانکہ کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔ ارے ہاں میں یہ مانا ہی بھول گئی کہ آج حسن دوپہر میں آیا تھا۔ حالت اتنی بری بھی نہ تھی تاہم وہ کہیں پا کر مایوس سا لگ رہا تھا۔

مگر حسن کو تم کیسے جانتی ہو۔

جاننے کی بھی خوب رہی۔ اس نے جو نام بتایا وہ میں نے آپ سے کہہ دیا۔ پتہ نہیں

اس سے آپ کا کیا رشتہ ہے۔۔۔
 رشتہ تو بڑا نازک ہے۔ وہ میرا دوست ہے بلکہ کبھی تھا۔ وہ آج ہی دکھائی دیا۔
 لیکن..... یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اس کی اس خاموشی کو اس کی بیوی نے شاید بھانپ لیا۔ کم از کم اس سے مل لیا ہوتا
 اس سے ملنا ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی اپنے آپ سے ملے۔ اور میں اپنے آپ سے مل کر رسوا
 ہونا نہیں چاہتا۔۔

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔۔
 سمجھ کر بھی کیا کر دوں گی۔ یہ ایک لمبی داستان ہے۔ بس تم یہ بات دھیان میں رکھو
 جب بھی وہ یہاں آئے اُس سے کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔۔
 اس سے اتنا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔۔

مگر مجھے غریبی سے نفرت ہے۔۔
 نفرت کا یہ حق کس نے آپ کو دیا۔ وہ آپ سے کچھ مانگنے تو نہیں آیا تھا۔ کیا عجیب کہ
 وہ کسی اور کام سے آیا ہو۔۔

وہ پھر ایک دن ضرور آئے گا۔ میں اس کا سامنا کرنے کا شاید رابل نہیں ہوں۔۔
 میں نے اب تک جو کچھ بھی پونجی جمع کی ہے۔ وہ ہمارے لیے ہے اُس کے لیے نہیں۔ قسمل
 اس کے وہ کچھ اور کہتا۔ گھر کی دہلیز پر وہ مسکراتا کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر طنز کی
 کاٹ تھی جیسے اس نے ہماری سب باتیں سن لی ہوں۔

جب گھر کی دہلیز پر قدم رکھ ہی چکے ہو تو اندر ہی آ جاؤ۔۔

وہ ایک شانی بے نیازی کے ساتھ کمرے پر آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے سر دست کل کا اخبار

چاہیئے۔

آج کا کیوں نہیں۔۔

کیوں کہ میری زندگی کا کل آج سے میل نہیں کھاتا۔۔

وہ لگتا ہے کچھ پریشان سے ہو۔۔

وہ نہیں۔ میں دیکھی ضرور ہوں۔ لیکن پریشان نہیں۔

• بات ہیر پھیر کر وہیں پہنچتی ہے۔ جس سے تم گریزاں ہو۔“

میں نے گل ہی [EN DOS COPY] کمروائی ہے۔ بڑا خراب [Test] ہوتا ہے

یہ۔ اللہ کا کم ہے کہ کوئی گروتھ [Growth] نہیں ہے۔ لیکن مرض سی گریڈ

مک پہنچ چکا ہے۔ علاج کرنے کی سکت نہیں ہے۔ لوگوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کسی خیراتی

ہسپتال میں آڈمٹ ہو جاؤں۔ تمہارا کیا مشورہ ہے؟

میں نے آج تک کسی کو کوئی مشورہ نہیں دیا۔ دراصل کسی بھلے مانس نے بھی مجھ سے

مشورہ مانگنے کی رحمت نہیں کی۔“

تو گویا تم اب اتنے گئے گزرے ہو گئے ہو۔

گئے گزرے تو تم ہو۔ میں نہیں۔ اس کا ثبوت تمہارا یہ چہرہ ہے خیر یہ بتاؤ برسوں

بعد اچانک تمہیں میری یاد کیسے آگئی۔“

وہ اس طرح کہ تم میرے مقروض ہو۔ چاہتا ہوں کہ تم سے کچھ لے کر ہی اٹھوں۔“

میں اور تمہارا مقروض...؟ کیا پاگل ہو گئے ہو۔“

اس کو منٹ پر بجائے وہ شرمندہ ہونے سے واقعی کسی پاگل کی طرح قہقہہ لگاتا رہا۔

جی چاہ رہا تھا کہ اس کا گلا گھونٹ دوں۔ لیکن اب وہ بید کی طرح کانپ رہا تھا۔

تم تو بے طرح کانپ رہے ہو۔ تھوڑی دیر سکون سے بیٹھو۔ چائے پیو اور چلتے ہو۔

کہاں جاؤں۔ کوئی منزل کوئی ٹھکانہ۔ کوئی شیڈر۔ میرا تو کوئی گھر نہیں ہے

بال پاؤں پھیلائے جب جی چاہا سو جاؤں۔“

تو پھر مسلسل شرک پر چلتے رہو۔ نیند جیب غلبہ پالے گی تو تم کہیں ناکہیں سر کے بل

گرہ جاؤ گے۔ لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور حربہ نہیں۔

کم از کم اس بہانے دو اخانہ پہنچا دیے جاؤ گے۔ تمہارے السر کا علاج شاید وہیں ہو

چائے یہاں نہیں چائے کا علاوہ کچھ نہ ملے گا۔“

”سردست چائے ہی سہی۔“

اُسے حیرانی ہوئی کہ وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اب چائے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ یہ سودا
اس کے لیے مہینگانہ تھا اس لیے اس نے بیوی کو آواز دے کہ دو کپ چائے کی فرمائش کی۔
اس کی بیوی چائے کی دو پیالیاں تھا مے اب سامنے کھڑی تھی۔
بھابی آپ کا بھی کوئی جواب نہیں۔ مگر میں چائے نہیں پیوں گا۔ کہاں دو ہزار روپے
کہاں یہ حقیر سی چائے۔

کوئی ثبوت ہے آپ کے پاس۔؟“
کل ثبوت ہی کے ساتھ آؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تیری سے باہر
نکل گیا۔

حسن نے جو کچھ کہا۔ کیا وہ سچ ہے؟“
”کیا اس کے ساتھ تم بھی پاگل ہو گئی ہو۔ وہ جھوٹا ہے ایک دم جھوٹا۔“
”مگر اس نے جو کل آنے کی دھمکی دی ہے۔ اس کا کیا کر وگے۔“
”میرے پاس اس کا بھی علاج ہے۔ تم دیکھ لینا وہ کل نہیں آئے گا۔“
”کل نہ پہنچے دن بعد بھی تو آسکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آفس ہی میں آدھکے۔“
”تم اطمینان رکھو وہ آفس بھی نہیں آئے گا۔ اب تم جھٹ پٹ میرے لیے چائے بناؤ
سر پھٹا جا رہا ہے۔“

ابھی تو آپ نے پی ہے۔“
میں نے۔؟“
ہاں آپ نے۔ یہ بیالی گواہ ہے۔“
”تم بھی ثبوت اور گواہی کی باتیں کرنے لگیں۔ خیر اخبار ہی لا دو۔ صبح میں نے صرف
شریالی ہی دیکھی تھیں۔“

”کیا متن کا زہری سکو گے۔؟“
”کیا بک رہی ہو۔؟“
”لگتا ہے تم نے وہ نظم نہیں پڑھی۔“

”کوئی نظم۔“

”وہی جس کا کوئی عنوان نہ تھا۔“

سرخیاں اخبار کی پڑھ لو

آج

اتنا ہی کافی ہے

کون مشن کا دہریئے گا

کس کو اتنی فرصت ہے

یہ تو روز کا رونا ٹہرا

ارے یہ دروازے کی زنجیر کون پیٹ رہا ہے۔ کہیں وہ کھٹ پیر آدی پھر نہ آدہم کا ہو۔“

اس نے توکل آنے کی دھمکی دی ہے۔“

کل اور آج دونوں اس کے لیے برابر ہیں۔ مگر یہ کوئی اور غلیٹ ہے۔

اس نے باہر آکر دیکھا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

دوسرے دن آفس سے لوٹتے ہوئے جب اس نے پہلا قدم دہلیز پر رکھا تو سب سے

پہلا سوال اس نے ہی کیا۔ کیا وہ غلیٹ آیا تھا۔؟

”نہیں۔“

میں نے تم سے کہا تھا نہ کہ اب وہ یہاں نہیں آئے گا۔ کسی کھڈیا خیراتی اسپتال میں

پراسیک رہا ہوگا۔ چھوٹے لوگوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

تیسرے دن بھی اس نے ہی سوال کیا۔

کیا وہ آج آیا تھا۔؟

”نہیں۔“

کیا وہ آج۔؟

نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔

سرپک گیا نہیں کہتے کہتے ۔۔

کیا تم جانتی ہو وہ آنے والا کون تھا ۔ ؟

ہاں جانتی ہوں ۔

کیسے — ؟

جس طرح تم جانتے ہو ۔ !

گمریہ

جنازے میں سبھی لوگ شریک تھے۔ مگر وہ گھر میں دروازہ بند کیے سوتا رہا۔ سوتا کیا رہا۔ بس یوں سمجھ لیجئے جاگنے اور سونے کے عذاب میں جھلستا رہا۔ اس کے ساتھی نے تیسری بار آکر اس سے کہا۔ جنازہ اب اٹھنے ہی والا ہے وہاں لوگ باگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چلو چل کر اپنے یار کا آخری دیدار کر لو۔، جنازہ تو اسی سڑک سے گزرے گا اور میں اس ماتمی جلوس میں شریک ہو جاؤں گا۔، اس نے عجیب انداز سے کہا۔

و کیا ضروری ہے کہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے؟ قبرستان جانے کے لیے اور راستے بھی تو ہیں۔، یہی بات تم وہاں آکر کیوں نہیں کہتے کہ یہ سڑک جنازہ جانے کے لیے موزوں ہے۔،

و تم نے مجھ سے سوال کیا میں نے جواب دے دیا۔ تم چاہو تو میرے خیالات ان تک پہنچا دو۔، ٹھیک ہے۔، اس کے ہونٹوں پر نفرت کی ایک بد صورت لکیر ابھری۔ اور وہ پہلو بچاتا ہوا آگے نکل گیا۔

اب وہ دروازے کے باہر کھڑا اپنے ساتھی کو گلی میں غائب ہونے تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ان دو جانے پہچانے آدمیوں کو دیکھا جو کندھوں پر شال ڈالے تیز تیز راستے پر چلے گئے تھے۔

اس نے سوچا۔ شاید یہ لوگ بھی وہیں جا رہے ہوں۔ لیکن خلاف توقع وہ تھوڑی دور جانے کے بعد پلٹ کر اسی راستے پر آگئے جہاں سے وہ تھوڑی دیر پہلے گزرے تھے۔ و کیا آپ نے ادھر سے کسی جنازے کو گزرتے دیکھا ہے۔؟،

”و ابھی تک تو نہیں۔“ اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”حیرت ہے۔؟“ دوسرے آدمی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”کیا ضروری ہے کہ وہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے؟“

”کون سا جنازہ؟“

”وہی جنازہ جس کے لیے آپ دونوں.....“

”کیا آپ بھی.....؟“

”نہیں میرا مسئلہ بالکل الگ ہے۔ میرے انتظار کی نوعیت آپ سے مختلف ہے۔“

”گویا آپ کو جنازے کا انتظار نہیں ہے۔؟“ دونوں نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

”ہے بھی اور نہیں بھی۔ اور اگر ہے تو اسی سڑک پر میری اس سے ملاقات ہو

جاوے گی۔“

”جنازے سے؟“ ایک نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ اور دوسرے نے اسے

اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی مشتبه آدمی ہو۔

کیا ضروری ہے کہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے۔ اسے لگا جیسے چٹانوں میں دبا

ہو اکوئی آدمی اس سے کچھ کہہ رہا ہو۔

”کیا آپ نے کسی جنازے کو ادھر سے گزرتے دیکھا ہے؟“

”و ابھی تک تو نہیں۔“

پھر اس نے گھر کے سامنے کھڑے کئی جنازوں کو گزرتے دیکھا۔

یہ سارے جنازے اجنبی تھے وہ لوگ بھی اجنبی تھے جو جنازوں کا بوجھ اٹھا

آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ فضا میں بڑی گھٹن تھی۔ نہ دن کا ہی احساس ہوتا تھا نہ

رات کا۔ کچھ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔

وہ سوچ کے گہرے سمدر میں ڈوب گیا۔ اس کے ساتھی نے تو صبح صرف ایک

ہی جنازے کی اطلاع دی تھی اور یہ جنازوں کا نہ ختم ہونے والا ماسی جلوس۔

”یہ کون لوگ ہیں جو موت کی سرحد کو پھلانگ گئے اور مر گئے۔ مگر وہ جنازہ؟“

کیا وہ اس سڑک سے نہیں گزرے گا۔ کوئی اور راستے پر چل پڑے گا۔ ان ناہموار راستوں پر جہاں وہ اپنے قدموں کے نشان ثبت کرنا نہیں چاہتا۔ ان ٹیڑھے میڑھے راستوں سے یہ سیدھی سڑک کیا بُری ہے جس کے سینے پر وہ صبح سے کھڑا ہے۔ ایک عجیب و غریب کیفیت سے دوچار۔

اچانک اس نے دیکھا۔ دو معمر آدمی جن کے سر کے بال برف کی مانند سفید تھے جن کے کندھوں پر اجلی شالیں تھیں۔ ہاتھ میں عصا تھا مے اس کے قریب آ رہے ہیں۔ ارے یہ تو وہی لوگ ہیں جن سے وہ صبح مل چکا ہے۔ مگر یہ اتنی جلد بوڑھے کیسے ہو گئے لگتا ہے جیسے کسی تاریخی کھنڈر سے اچانک نمودار ہو گئے ہوں۔ کہیں یہ اس کا واہمہ تو نہیں ہے۔ نہیں نہیں یہ ایک حقیقت ہے۔ وہی چہرے۔ وہی اجلی شالیں۔ وہی سوئی کپڑے۔ سب کچھ وہی۔ وہ ان چیزوں کو کیسے بھول سکتا ہے۔

کیا وہ صبح سے اپنے گھر کے دروازے کے باہر نہیں کھڑا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ وقت چلتے چلتے اچانک ٹھم گیا ہو۔

مگر یہ کیا؟ اس کے گھر پر کس نے تالا چٹھھا دیا۔ صبح تو دروازہ کھلا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ لوگ اس کے سامنے سے گزر گئے اور وہ انھیں دیکھ نہ سکا۔

اسے یہ دیکھ کر مزید حیرانی ہوئی کہ اس کے گھر پر TOILET کی تختی لگی ہوئی ہے تو گویا وہ یہ مکان بھی چھوڑ چکا ہے۔ اس کے گھر والوں نے کہیں اور ڈیرا جمالیا ہے لیکن صبح سے شام ہونے تک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔

اُسے یاد آیا کہ صبح اس کے ساتھی نے گھر آکر اس سے کہا تھا۔ کیا کہا تھا اس کے ساتھی نے؟

وہ اچانک اس واقعے کو بھول گیا۔ وہ جتنا ذہن پر بار ڈالتا تھا اتنا ہی اپنے ساتھی کے اُگلے ہوئے حملوں کے سرے کو نہ پاتا۔

وہ ایک عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو گیا۔ اب اُسے یہ سڑک بڑی دیرانہ سی لگ رہی تھی۔ ہر جگہ سے کٹی بھٹی۔ بیمار اور مضحک۔

مگر وہ سڑک پر اس طرح کیوں کھڑا ہے۔ اس بچی سے اس کا کیا رشتہ ہے۔

کیا وہ بھی اسی طرح.....

ان ہی حالات میں.....

یوں ہی —

فضول —

اُسے کچھ سمجھا ئی نہ دیا اور وہ بدستور سڑک سے چٹا رہا۔ اس نے پلٹ کر پھر
ایک بار اپنے گھر کو دیکھا۔ دیوار کے سینے میں دھنسی ہوئی، TOILET "کسی سیاہ تختی
اُسے سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یکبارگی اس نے اپنے قریب ان
دوبوڑھوں کو آتے دیکھا۔ جن کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے اور جن کے شانوں
پر اچلے رنگ کی شالیں لپی ہوئی تھیں۔

وہ کیا تم نے کسی جنازے کو اس طرف سے گزرتے دیکھا ہے ؟

وہ ابھی تک تو نہیں۔

وہ حیرت ہے۔ پہلے آدمی نے دوسرے آدمی سے مخاطب ہو کر کہا۔

وہ کیا ضروری ہے کہ جنازہ اسی سڑک سے گزرے۔

وہ کون سا جنازہ ؟

اس بار بہ یک وقت تینوں ایک ساتھ بول اُٹھے اور ایک دوسرے کے

گلے لپٹ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔ !!

ریت کے محل

وہ عجیب آدمی تھا۔

اس کے جسم کے سارے کل پُرزے مضحکہ خیز حد تک بگڑے ہوئے تھے۔ موٹی موٹی اُبھری اُبھری سی آنکھیں باہریوں نکل آئی تھیں، جیسے کسی نے اس کا گلابا کر چھوڑ دیا ہو۔ کدو کی طرح لمبوتراسر، دبی دبی سی پیشانی، چیلٹی سی ناک، ہونٹ بھی عجیب طرح کے پکلا ہونٹ جتنا باریک اور خوبصورت تھا اوپر کا ہونٹ اتنا ہی موٹا اور بھڑا۔ عموماً پکلا ہونٹ اوپر کے ہونٹ کی برعکسیت کچھ موٹا سا ہوتا ہے لیکن اس کے یہاں بات ہی برعکس تھی۔ پھر مُرقہ یہ کہ اس کا قد بھی ناٹا سا تھا۔ ان تمام خوبیوں نے مل کر اسے اچھا خاصا کارٹون بنا دیا تھا۔ گویا وہ آدمی پلٹے پلٹے رہ گیا تھا ناٹے قد کا ہونے کے باعث لوگ اسے دیکھ کر مسکرا دیتے وہ بھی خواہ مسکرا دیتا۔

پیلے پیل جب لوگوں نے اس کے ناٹے قد پر ہچکچتیاں کیں تو اس کے تن بدن میں ایک آگ سی لگ گئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ ان باتوں کا عادی سا ہو گیا تھا۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ وہ ایک بے ہودہ انسان ہے۔

میں نے اسے پہلی بار کنگسٹون کے ایک بک اسٹال پر کھڑا دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ”امپرنٹ“ کا تازہ پریچر تھا میں نے بک اسٹال پر چند پرچے اُلٹ پلٹ کیے۔ میری اس عادت سے سکندر آباد کا ہر دوکاندار واقف ہے لیکن اس کے ساتھ میں کبھی کبھار ایک آدھ پرچہ خرید بھی لیتا۔ ناٹے قد کے اُس بد شکل آدمی کے ہاتھ میں ”امپرنٹ“ کا تازہ پریچر دیکھ کر میرے احساس کے آگینے پر ایک چوٹ سی لگی۔ اس نے مجھے کنگھیوں سے دیکھا۔ اور میں نے بھی نفرت سے اس پر پھر پوزنگا ڈالی۔ وہ آہستہ دوکان سے کھسک کر پریس اسٹاپ کے

یاس آکھڑا ہوا۔ پھر بس آئے ہی وہ رینگتا ہوا بس میں سوار ہو گیا۔ میں نے دوسری بس کیچ کی اور چین پر اتر گیا۔

چین اس راستے کا نام ہے جو افضل گنج سے ہوتا ہوا چارمینار سے جا ملتا ہے۔ پھر عابد رڈ کے چوراہے پر میں نے اسے رات کے کوئی دس بجے کسی شخص سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا اب اس کے ہاتھ میں ”امپرنٹ“ کے علاوہ دو ایک پر پے بھی تھے۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کیا ایک ناٹے قد کا بد شکل انسان بھی ادب اور اخبار بینی کا اتنا تھرا سٹھرا ذوق رکھ سکتا ہے۔

پھر میں نے اسے چھ آٹھ ماہ تک کہیں بھی نہیں دیکھا۔ میں چین میں رہ کر بھی پھولوں کی خوشبو سے محروم تھا۔ ایک چھوٹا سا فلیٹ میرا ڈرائنگ روم، غسل خانہ سب ہی کچھ تھا۔ اور مجھے اس گندے فلیٹ سے نفرت سی ہونے لگی تھی اس لیے میں نے سوچا کیوں نہ ایک صاف ستھرا مکان لیا جائے۔ پھر میں نے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

آج صبح آفس میں میرے ایک ساتھی نے کہا۔ حایت نگر میں ایک مکان خالی ہوا ہے پٹرول پمپ کے قریب ہی۔ اور میں آفس سے لوٹتے ہوئے حایت نگر کے بتائے ہوئے پتہ پر آکر ٹہر گیا۔ پھر میں نے ایک آدمی سے خالی مکان کا پتہ پوچھا۔ اس نے کہا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے یہاں پر کوئی مکان خالی نہیں ہے۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر کہا ”ہاں اس طرف ایک مکان شاید کرائے پر اٹھنے والا ہے۔“

میں نے اس شخص کا رسما شکریہ ادا کیا اور اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے لگا۔ دو منٹ بعد ہی ”TO LET“ کے بڑے حروف پر آکر میری نگاہیں جم گئیں۔ میں نے زور سے پھاٹک کے دروازے کو ہاتھ سے مارا۔ پڑوس کے مکان کی کھڑکی کھلی، اور پھر بند ہو گئی۔ میں نے دو منٹ کے وقفے سے پھر پھاٹک کے قریب آکر دستک دی۔

آپ بے کھٹکے مکان کے اندر چلے جائیے۔ ایک بہت ہی خوبصورت نسوانی آواز فضاء میں گونجی۔

”جی شکریہ“ کہتا ہوا میں مکان کے اندر داخل ہوا۔ اندر جا کر سارا مکان دیکھا۔

مکان صاف ستھرا تھا۔ دو خوب صورت کشادہ کمرے، ڈرائنگ روم، غسل خانہ سب ہی کچھ تھا جو ایک متوسط طبقے کے شائستہ آدمی کے لیے ضروری ہے۔

جب میں پھاٹک کے قریب آیا تو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ان محرم نے کہا۔ ”کیا آپ کو پسند آیا ہمارا مکان؟“

”جی ہاں پسند آیا۔“

”تو ذرا گھر گئے۔ میں انھیں ابھی جگا کر بھیجتی ہوں۔“ اُس نے نہایت نرمی سے کہا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ کنواری یا دوشیزہ نہیں بلکہ شادی شدہ عورت ہے۔ پھر ایک شخص آنکھیں ملتا ہوا یا ہر آیا۔ میں نے دیکھا یہ وہی شخص تھا جسے میں نے کنگسوے کے بک اسٹال پر دیکھا تھا۔ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔“ میں نے یوں ہی فضا خوشگوار کرنے کی خاطر کہا۔

”ہاں صاحب دیکھا ہوگا۔ کچھ ہماری شخصیت ہی ایسی ہے کہ لوگ دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے طنز آمیز لہجے میں یوں کہا جیسے وہ اپنے خالق سے گلہ کر رہا ہو۔

”کیا کریہ ہے اس مکان کا؟“

”پندرہ سو روپے۔ اگر آپ دو ماہ کا کرایہ پیشگی دے دیں تو آج ہی مکان آپ کی تحویل میں دے دوں گا۔“

دوسرے دن میں فلیٹ بدل چکا تھا۔ صبح جب صاف ستھرے کپڑے پہن کر دفتر جاتا تو کھڑکی کا پیٹ آہستہ سے کھلتا ہوا مجھے دکھائی دیتا اور میں نے بار بار اُسے برآمدے میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ آج صبح میں آئینے کے سامنے کھڑا شیوہ بنا رہا تھا کہ وہ آدھمکا۔

”آج میری سالگرہ ہے اس لیے آج رات کا کھانا ہمارے ہاں کھائیے۔“

میں کچھ تامل کے بعد اس کے اصرار کرنے پر راضی ہو گیا جب وہ چلا گیا تو میری زبان سے بے ساختہ نکلا کارٹون کا بچہ بڑا یا سالگرہ منانے شام کو جب میں نے اس کے دروازے پر دستک دی تو وہ مسکراتا ہوا باہر نکل آیا اور بڑے ہی خلوص سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا۔

”یہ میری بیوی ہے۔“ اس نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

میں نے چورنگا ہوں سے اس کے خدو خال کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی حسین و جمیل لڑکی تھی۔

زیادہ سے زیادہ بیس یا بیس سال کی ہوگی۔ لیکن اس کے خدو خال میں ایک بانگن تھا۔ ایک کشش تھی۔ اس کی آواز میں کنواری لڑکی کا سالوچ تھا۔

مجھے اس نائٹے قد کے بد شکل انسان کی آزاد خیالی پر حیرت اور خوشی ہوئی جس نے بغیر کسی بیجا شرم و حیا کے اپنی بیوی سے تعارف کرانے میں بھی ذرا جھجک محسوس نہیں کی۔ پھر کچھ دنوں بعد میں نے انھیں دعوت دی۔ چونکہ میں تنہا تھا اس لیے میں نے ڈنر کا سارا انتظام ہوٹل سے کروایا تھا جب وہ دونوں میرے گھر آئے تو میں نے خوشی سے ان دونوں کا گرم خوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد رات دیر گئی تک وہ دونوں مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ اس کی بیوی ایک تعلیم یافتہ راتولی ہے اور اس کا شوہر، ملک کا ایک مشہور کارڈیونسٹ وہ مجھ سے بہت جلد بل لگے جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہوں۔ کبھی میں ان کے ہال جایا کرتا اور کبھی وہ میرے ہال پہلے آتے لیکن کبھی میں نے اُسے اپنی بیوی کو شام میں اکسلا پھوڑ جاتے نہیں دیکھا تھا اور وہ ہمیشہ اپنی بیوی کے ساتھ نکلا کرتا۔ لیکن ایک شام جب میں اُس سے ملنے گیا تو وہ گھر پر نہیں تھا۔ اُس کی بیوی نے جب مجھے آتے دیکھا تو بہت تپاک سے اور مسکراتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ آج پہلی بار میں اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں اس کے گھر گیا تھا۔

”رات میں نے وہی بڑے بناائے تھے“ اس نے شرارتے ہوئے کہا۔
 ”وہیں آپ کے لیے لے آتی ہوں“ وہ کہہ کر سے اٹھ کر باورچی خانے میں گئی اور ایک پیالے میں وہی بڑے لے آئی میں نے انھیں چکھا۔

”بہت لذیذ بناتی ہیں آپ“ میں نے اس کی تعریف کی۔

”ہاں کچھ ان کا بھی یہی خیال ہے“ وہ بولی

میں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کچھ انٹرویو کے سبب انداز میں پوچھا۔

”کیا لائٹ میوزک سے بھی آپ کو دلچسپی ہے؟“

”کیوں نہیں، بہت زیادہ ہے۔ انہیں بھی تو میوزک سے بہت زیادہ لگاؤ ہے۔“

مجھے کوفت ہوئی تھی کہ وہ ہر بات میں خواہ خواہ اپنے شوہر کا حوالہ دیتی ہے۔

اور دو افسانے سے بھی آپ کو کچھ دلچسپی ہے؟“ یہ میرا دوسرا سوال تھا۔
 اور مٹھو میرا فیورٹ رائٹر ہے، میرا خیال ہے مٹھو سے اچھا افسانہ نگار ہندو پاک نے پیدا
 نہیں کیا۔

پھر میں نے گفتگو کا پہلو بدلتے ہوئے پیالے میں رکھے ہوئے وہی بڑوں کی طرف اشارہ کرتے
 ہوئے کہا۔ ”سفید وہی میں یہ بڑے کتنے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ اگر وہی کی جگہ انھیں کسی سالن
 میں ڈال دیا جائے تو کتنے بڑے معلوم ہوں گے۔“

میں نے دیکھا میرے اس سوال پر اس کا پھول سا کول چہرہ کچھ اتر سا گیا تھا۔ کچھ دیر خاموشی
 طاری رہی پھر اس نے ایک فرائنگ انکوائری کے ساتھ بھرپور جا ہی لی جیسے اب وہ سونا چاہتی ہو۔
 مجھے احساس ہوا کہ میں زیادہ دیر بیٹھ گیا ہوں۔

”اچھا اب اجازت دیجئے۔ آپ تھک گئی ہوں گی۔“
 ”جی نہیں مجھے تو آپ سے باتیں کرنے میں بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے۔“
 دیوار پر لٹکی ہوئی بڑی گھڑی نے زور و شور کے ساتھ بات کے دس بجائے۔
 ”اوو دس بج گئے وہ ابھی تک نہیں آئے۔“

اور میں چاہ رہا تھا کہ اس کا شوہر ابھی دئے تاکہ جی بھر کر میں اس سے باتیں کر سکوں، لیکن
 دوسرے ہی لمحے کسی کے قدموں کی دہنی سی چاپ میرے پیچھے آئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ میرا کارڈنٹ
 دوست مسکراتا کھڑا تھا۔

کیا میں آسکتا ہوں۔ اس نے کہا۔

”آئیے تشریف لائیے۔“ میں نے اس انداز میں کہا جیسے یہ میرا گھر تھا اور وہ میری طرح پڑوسی۔
 آج رات آپ کو بہت دیر ہو گئی۔ اس کی بیوی نے تشویش کے انداز میں پوچھا۔
 ”ہوایہ کہ“ بھاشا کے مدیر در اس سے آگئے تھے وہ نہر دستہ تھے اپنے گھر گھنچ لے گئے اور
 ہاں مجھے ان کے شدید امر اور کھانا، کھانا ہی پڑا۔ میں نے لاکھ کہا کہ بھئی میں اپنی بیوی کے بغیر کھانا
 کھا نہیں سکتا کیوں کہ وہ کھانے پر میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ لیکن انہوں نے نہیں مانا اور کہا اب تو
 کھا بھی لو۔ شریستی جی کے ساتھ کل پھر آپ کی دعوت رہے گی۔

”تم نے کھا لیا۔؟“ کا رٹونٹ نے اپنی بیوی سے پوچھا۔

”جی نہیں میں آپ کے بغیر کیسے کھا سکتی ہوں۔ میں نے آپ کے لیے آج دہی بڑے بنائے تھے۔“
اور پھر تو بڑا ستم ہوا۔ اب کھانے کی گنجائش بھی تو نہیں۔ خیر کچھ لاہی دو۔ ہم دونوں ایک دو بڑے
چکھری لیں گے۔“ اُس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جی میں نے ابھی کھا لیا ہے۔“ میں نے اپنے کا رٹونٹ دوست سے معذرت چاہی۔

”اوہ! آپ نے کھا لیا؟“

پھر اس نے کھسیانہ ہو کر کہا۔ ”اور کھایے دہی بڑے ہی تو ہیں۔“

رات زیادہ ہو چکی تھی، اس لیے میں مناسب بھی سمجھا کہ اب گھر چلنا چاہیے۔ میں گھر آ کر بستر پر
دراز ہو گیا۔ کسی کروٹ نیت نہ آئی۔ خیالات جاڑے کے آوارہ باد لول کی طرح منتشر ہو رہے تھے۔ میرے
دماغ پر کا رٹونٹ کی بیوی چھائی ہوئی تھی۔ کتنی حسین و جمیل ہے وہ گلاب کے کول بھول کی طرح تازہ
و شاداب۔ مجھے محسوس ہوا جیسے کا رٹونٹ نے میرے سینوں کی الپسرا کو مجھ سے پھین لیا ہو۔ ایک
بدشکل آدمی کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ ایک بھول کی طرح نازک دوشیزہ کو اپنا شریکِ حیات بنائے۔
جانے کجخت نے اس پر کیا جادو ٹونے کیے ہیں جو وہ اُسی کی ہو کر رہ گئی ہے۔ ورنہ میرے سامنے یہ پہلی
مثال تھی۔

رات بھر میرے خوابوں میں اس کا حسین و جمیل چہرہ قس قس کرتا رہا۔ صبح جب میں اٹھا تو میری آنکھیں
بوجھل تھیں۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد میں اپنے آفس چلا گیا اور جب آفس سے لوٹا تو اپنے گھر
جانے سے پہلے کا رٹونٹ کے گھر آواز دی۔ لیکن کسی نے کوئی جواب نہیں دیا مجھے کچھ شبہ سا ہوا کہ
کہیں میرے دوست نے بُرا تو نہیں مانا کیوں کہ میں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کی بیوی سے
بات چیت کی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میرا شک رفع ہو گیا جب میں نے پچانک پر پڑے ہوئے
تالے کو دیکھا۔ شاید وہ دونوں مدراسی ایڈیٹر کے ہاں دعوت میں گئے ہوں۔

دوسرے دن صبح وہ میرے گھر آیا۔ وہ بہت عجلت میں تھا۔

آج میں ”بھاشا“ کے ایڈیٹر کے ساتھ ضروری کام سے مدراس جا رہا ہوں، چار دن میں
لوٹ آؤں گا۔ تم مکان کا دراز خیال رکھنا۔ آشا بے حد حساس ہے۔ تنہائی سے وہ بہت گھبراتی

ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے آنے تک آشا کا دل بہلاتے رہو گے۔ وہ مجھ سے ہاتھ ملاتا ہوا چلا گیا۔
 وہ چلا گیا لیکن اب میں سوچنے لگا۔ کتنا عجیب آدمی ہے۔

کوئی اپنی بیوی کو غیر مرد کے بھروسے اس طرح چھوڑ جاتا ہے۔ پھر وہ بھی ایک بچلے کے دم و کمر پر ہوسکتا ہے۔ میری ہی نیت ڈالو تو دل ڈول ہو جائے۔ آخر میں بھی تو ایک انسان ہی ہوں۔ یہ
 اور بات ہے کہ میری رگوں میں شہرِ نقول کا خون ہے۔

میں نے دبے پاؤں اس کے گھر میں قدم رکھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ آخر کیلے گھر میں کیا کر رہی
 ہے۔ میں نے دیکھا وہ قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ آئینے میں میرے
 عکس کو دیکھ کر اُس نے کہا ”آجائے“

پھر جب پلٹ کر اُس نے میری طرف دیکھا تو میرا دل دھک سا ہو کر رہ گیا۔ وہ آج نیلے رنگ
 کی ساری میں یوں نظر آ رہی تھی، جیسے بادشہ کے بعد دھنک نکل آئی ہو۔ وہ مسکرائی۔ اُس کے گالوں
 پر حیا کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ پھر اُس نے کہا۔

”آج موسم کتنا سلوتا ہے۔ ٹینک بند چلئے بڑا مزہ ہے گا۔“

لیکن مشکل یہ ہے کہ میں آپ کا ساتھ اس وقت نہ دے سکوں گا۔ میرے اس غیر متوقع جواب
 پر اس کا چہرہ کچھ اترا سا گیا۔

”آخر کیوں نہ چلیں گے آپ۔۔۔؟“ اس نے حاکمانہ انداز میں پوچھا۔

”کون آپ کے ساتھ چل کر خواہ خواہ لوگوں سے جھگڑا مول لے؟“ وہ شراسی گئی۔ اس کی

نفسانی پر غرور و مسرت کی ایک چمک پیدا ہوئی۔ چلے بھی چھوڑیئے مذاق۔ خوب ہنستے ہیں آپ!۔
 دیر گئے تک ہم ٹینک بند پر بیٹھے مختلف باتیں کرتے رہے اور میں جانے کیا کیا سوچنے لگا۔ لیکن
 جب لوٹتے ہوئے پھر اس نے اپنے شوہر کی محبت کے قصے چھیڑ دیئے تو مجھ پر سے خوش فہمی کا بھوت
 اتر گیا۔

رات جب ہم گھر لوٹے تو گیارہ بج چکے تھے۔ میں آشا کو اُس کے گھر تک پہنچا آیا۔ جب میں نے
 آشا کے کمرے کی لائٹ جلائی تو میرا کارڈ فونٹ دوست خراٹے لیتا ہوا سو رہا تھا میں اپنے دوست
 کو دیکھ کر سہم سا گیا۔ جیسے میں نے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔ اُس کا منہ چھوٹے بچوں کی طرح کھلا ہوا

تھا اور ہونٹوں کے کنارے تھوک بہہ بہہ کر نکلے پر جم گیا تھا۔

صبح جب میں دیر سے اٹھا تو میری آنکھیں رات کی یادوں کے خمار سے بوجھل تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری پلکوں میں گزشتہ رات کے جلتے جاگتے خواب کے ٹکڑے اٹک گئے ہوں۔ میں بڑی دیر تک آشاکے بارے میں سوچتا رہا۔ اور اس محویرے میں مجھے آفس کا بھی خیال نہ رہا۔ چنانچہ میں آفس دیر سے پہنچا۔

تین دن تک آشاکہ اور کارٹونسٹ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ میرے دل میں گمان پرورش پارہے تھے کہ شاید کارٹونسٹ نے میری اس حرکت کا برا مانا ہے اور شاید ہی خوف مجھے اس کے گھر تک پہنچنے میں مانع تھا۔

چوتھے دن شام کو کارٹونسٹ میرے گھر آیا۔ اور اس نے بڑی فراخ دلی سے گزشتہ دنوں کی غیر حاضری کا سبب دریافت کیا مجھے اس کے رویے سے بڑی طمانیت ہوئی۔

”و سنہا کہ اُس دن خوب باتیں دیں ۛ میں جواب دینے ہی کو تھا کہ اُس نے کہا۔ چلو بہارے گھر آنا تمہیں یاد کمرہ ہی ہے ۛ

آشاکہ کا نام سنتے ہی میرا دل جیسے حلق میں پھنس کمرہ گیا۔ میں چپ چاپ اس کے ساتھ ہو گیا دوران گفتگو میں اس نے بتایا کہ اس کا مدراس جانے کا پروگرام کس طرح ٹھپ ہوا اور کس طرح طرین تک پہنچنے میں دیر ہوئی۔ غرض کہ کارٹونسٹ اپنی کہے جا رہا تھا اور مجھے آشاکہ کو دیکھنے کے خیال ہی سے کچھ شعلے سے دل میں لپٹے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ میں اور کارٹونسٹ جب گھر میں داخل ہوئے تو آستانہ فوراً کہا شکر ہے آپ کو ہماری یاد بھی آئی۔ ورنہ میں نے تو سمجھا تھا کہ آپ ہیں بھول گئے ہیں ۛ

”میں بھلا آپ کو کیسے بھلا سکتا ۛ میرا گلا جذبات سے موندھ سا گیا۔ مجھے نہ جانے کیوں اس وقت کارٹونسٹ زہر لگ رہا تھا۔ میں خواہ خواہ اس کے خلاف بھرا بیٹھا تھا اور وہ مسخرہ اچھا جا رہا تھا۔

مجھے آشاکہ اور کارٹونسٹ کے اصرار پر رات کے کھانے پر بیٹھنا پڑا۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ ادب، آرٹ، سیاست غرض کہ ہر موضوع پر ہم لوگوں نے اظہار خیال کیا۔ فن تعمیر پر۔

ت چل نکلی تو اجلتے، ایلورہ کی گچھاؤں سے ہوتی ہوئی یونان کے جسموں تک جا پہنچی، تصویر کشی کا ذکر
چھڑا تو لیونارڈو کے موقلم سے پکا سونگ۔ شاعری موضوع بحث بنی تو چاروسرے ایلپیٹ اور
الفردو ڈوناٹس تک تقریباً سب ہی شاعر ہمارے بحث کی زد میں آتے رہے۔ میری مسرت کی انتہا :
وہی جب میں نے قدم قدم پر یہ محسوس کیا کہ آشنا میرے ساتھ ہے۔ اُس کے خیالات میرے ساتھ
ہیں۔ اس کا شوہر مجھے کسی کہسار کے تنہا پودے کی طرح نظر آنے لگا۔

ادھر نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ آشنا دن بدن میرے قریب آتی جا رہی ہے
میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال میرے ذہن میں کس طرح جوڑ پکڑ گیا کہ آشنا کو اپنے شوہر سے ضرور نفرت
ہی ہونی چاہیئے۔ بھلا ایک ٹھنکنے آدمی سے بھی کوئی محبت کر سکتا ہے۔ آشنا کے قُرب سے میں اپنے
شب و روز میں ایک ٹھنڈک ایک طراوٹ سی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے اس بات کا یقین ہو چلا تھا
کہ آشنا مجھے ضرور چاہتی ہے۔ میرے خیالات کو پسند کرتی ہے اور ان میں اپنی محبت تلاش کرتی ہے
ایک دن ہماری گفتگو کا موضوع کارٹون کشی تھا۔ میں نے ارادہ مذاق کہا۔ ”میرا خیال ہے
کہ جو مقصور اپنے فن میں ناپختہ رہ جاتا ہے، وہ کارٹونسٹ بن جاتا ہے“ اس پر آشنا نے ہنسی کی
جھا بھینچھنکا دیں اور کارٹونسٹ خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ آشنا جو اُس وقت بھول کا ڈھ رہی تھی۔
چہرے سے بے مد شگفتہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس شگفتگی سے خوب خوب نادمہ ٹھٹھانا چاہتا
تھا۔ اور اس کے شوہر کو اپنے مذاق کا ہدف بنا کر اُس کا جی بھلانا چاہتا تھا بلکہ یوں کہیے کہ اس پر
ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایک ایسے آدمی کے لیے جن میں بنائی گئی ہے جسے محفل میں مذاق کا جواب تک
ینے کا سلیقہ نہیں۔

اس کا مجھے اعتراف ہے کہ میں نے گفتگو میں مذاق سے کہیں زیادہ ذاتیات کو جگہ دے دی۔
ہوا یوں کہ میری کہی کے آگے ایک قد آدم آئینہ دکھا تھا جس کے برابر ہی نکھنے کی میز تھی۔
میں نے ہنستے ہوئے کہا ”آرٹسٹ جی! کہیں کارٹون بناتے ہوئے آئینہ نہ دیکھتے ورنہ کارٹون
شاہکار بن جائے گا“ میرے اس جملہ پر آرٹسٹ جی تو ہنسنے لگے لیکن آشنا نے خلاف توقع کوئی نوٹس
نہیں لیا اور برابر سنجیدگی سے بھول کا ڈھتی رہی۔ مجھے قدمے نا اُمیدی ہوئی۔ میں نے اپنے ترکش
سے دوسرا تیر نکالا اور چلا دیا ”قبلہ آرٹسٹ جی! میرا خیال تو یہی ہے کہ ایک بلند قامت آرٹسٹ

ہی اونکے درجے کی تخلیق کر سکتا ہے۔ یہی دیکھئے نا.....“

یہ کہہ کر جب میں نے داد طلب نگاہوں سے آشاک کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ زرد پٹ چمکا تھا۔

اور اس کے ہاتھ سے سوئی گر چکی تھی۔

شال

یار کیسے آدمی کو ہم نے کھو دیا۔۔۔ اب ایسی ٹھکی ٹھکانی طرح دارگالیاں ہیں کوئی دے گا۔ دوسرے ساتھی نے جو اس کے برابر ہی کھڑا تھا۔ کندھوں پر جھولتی ہوئی شال کو جسم پر لپیٹے ہوئے کہا۔ ”وہ شال دس ہزار گالیاں دینے کے بعد اس نے مجھے تحفہ دی تھی۔ جب تک یہ شال میرے جسم پر رہے گی وہ مجھے یاد آتا رہے گا۔“

وہ عجیب بات ہے اس نے مجھے کبھی گالی نہیں دی حالانکہ تمہاری طرح وہ بھی میرا کرتھا۔
وہ بھی تو بڑے بچڑی ہے تمہاری۔“

ویران قبرستان کی دم گھٹا دینے والی فضا سے نکل کر وہ اب رستوراں میں بیٹھے چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنا غم غلط کر رہے تھے۔ کیوں کہ بارگاہِ غم غلط کرنے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے۔ ان کی سیٹ کے برابر ہی ایک ادھیر عمر کا آدمی بظاہر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ تین دس کی تو بڑا مرکز مرنے والے کے وہ سینوں سے آٹھن لگے ہوئے چائے کی پیالیوں میں پیتے ہوئے تو بڑے ہمدرد تھے۔

”تمہیں یاد ہے اسی ٹیبل پر میری اس کی شدید لڑائی ہوئی تھی، کتنی گالیاں دی تھیں اس نے مجھے۔۔۔ یہاں تک کہ اس کے دونوں ہاتھ میرے گنگے پر۔“

”یاد رہے وقت نہیں ہے ان باتوں کو دہرانے کا۔ وہ اب ہم ہیں نہیں رہا۔ ایک دن ہم بھی نہیں رہیں گے۔“

وہ نہیں یاد اسے سب کچھ کہنے دو۔ گلے میں پھنسی ہوئی باتیں اگر وہ نہیں اگلے گا تو مرنے جائے گا۔ کم از کم اسے کچھ دن اور زندہ رہنے دو۔ ہم تو سمندر میں پھینکی ہوئی وہ بادبانی کشتیاں

ہیں جو ہوا کے اشارے پر چلتی ہیں۔ ہمارا کوئی ملاح نہیں ہے۔ اسے کہنے دو یار۔ اس کا
گلا نہ گھونٹو۔۔۔“

مگر وہ کچھ کہنے کی بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ روتے ہوئے وہ کچھ عجیب سا لگ

رہا تھا۔۔۔

”بھانڈا سالا۔۔۔“

دو سن رہے ہو بوڑھے نے ابھی ابھی کیا کہا۔۔۔“

وہیں نے سن لیا ہے۔ اگر وہ آج ہماری محفل میں ہوتا تو اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا یا اس

کی بیٹھ تھپتھپا کر کہتا۔۔۔ جیو میرے لال۔۔۔“

مگر وہ ابھی تک رو رہا تھا۔ بوڑھے کی جگہ اب خالی ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک کالا بھنگ

گھنگھریالے بالوں والا نیگرو بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ ٹیبل پر چینی کی پلیٹ میں کاغذ کا ایک پرزہ رکھا

ہوا تھا جس پر PAID کی مہر ثبت تھی۔

”وہ یہ بل ہم نے تو PAY نہیں کیا۔۔۔“

”وہ کیا تم نے بل PAY کیا۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔“

”اس پر تو PAID لکھا ہوا ہے۔۔۔“

”وہ کبھی کبھی اُدھار مانگی ہوئی زندگی کے چہرے پر کوئی مچھلا PAID لکھ دے تو نہیں شرمسا

نہیں ہونا چاہیے۔ زراعت کا بار اٹھانے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔۔۔“

”وہ مگر پھر بھی یہ جاننا ضروری ہے کہ بل کس نے ادا کیا ہے۔۔۔“

”بیرہ۔۔۔“

”بیرے کو بلوانے کی ضرورت نہیں۔۔۔“

وہ تینوں مٹا ہوئے سے اٹھ کر باہر آ گئے۔ ان تینوں میں سے کسی نے کہا۔ کیا ایسا نہیں ہو

سکتا کہ ہم میں سے کوئی کہیں سے پچاس روپے اُدھار لاے۔

اگر آج نہیں پی سکے تو سمجھ لو مہر گئے۔

”وہ پچاس روپے۔“ اتنی بڑی رقم اس وقت بھلا کون دے گا۔ سراج کو میٹرو میں دیکھ
 لیں گے ورنہ شراب کی جگہ اپنا خون ہی پی لیں گے۔“
 سراج نے تو کئی دن سے صورت نہیں دکھائی۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی موت سے کہیں زیادہ
 اسے دین پر شراب کی دھن سوار ہے۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ اندرونی طور پر ہم سب موت کے
 پندہ موت پرندے سے خائف ہیں نہ جانے کب وہ پر بھیلے اور اپنی نوکیلی چونچ ہمارے جسم میں
 داخل کر دے۔“

وہ اب خاموش چل رہے تھے۔ کچھ گھبرائے گھبرائے سے۔ یہ خاموشی بے معنی نہیں تھی۔
 اس خاموشی میں کئی معنی پنہاں تھے۔
 سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی اور کچی کشادہ غمارتوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے وہ
 اپنے آپ کو بونے محسوس کر رہے تھے۔
 ”لو میٹرو آگیا۔“

”اتنی جلد۔۔۔“ بیک وقت دونوں ساتھیوں نے حیرانی سے کہا۔ انھیں یقین نہیں
 آ رہا تھا کہ وہ اب میٹرو کے سینے پر کھڑے ہیں۔ لان میں کبھی ہوئی کہ سلیوں پر چند نوجوان بیٹھے
 گلاسوں میں شراب انڈیل رہے تھے جو پی چکے تھے وہ غلامیں بکھری ہوئی یادوں کو کیجا کر نے
 کی سعی لاماصل میں گرفتار تھے۔ بعض لوگ اس انتظار میں تھے کہ ویٹر آئے اور کاگ اڑے
 جب بھانت بھانت کے عجیب و غریب چہرے ہر طرف پھیلے ہوئے ہوں اور روشنی
 مدہم ہو تو بسا اوقات اپنی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔
 اب اس ہجوم میں سراج کو پانا ایسا ہی تھا جیسے کوئی آسمان کی پنہائیوں میں اڑنے
 والے پرندے کو اچک کر پکڑ لے۔

غوشی اور حقارت کے لمبے جملے جذبات کے ساتھ پلیٹوں میں رکھے ہوئے کاغذ کے
 پیرزوں پر ٹیپ کی شکل میں رکھے ہوئے پیسوں کے تھوک کو بیرے چاٹ رہے تھے۔
 مگر ابھی تک وہ پیاسے تھے۔

کیبن کے دروازے بند تھے۔ صرف لوگوں کے پاؤں میں دھنسنے ہوئے جوتے نظر

آ رہے تھے۔ یاد دھیلے ڈھالے تیلونوں میں چھپی ہوئی دہلی بٹلی، موٹی بھدی ٹانگیں اب صرف ایک ہی کیبن باقی رہ گیا ہے اگر وہ وہاں بھی نہ ملے تو —

کوئی دوسرا باب —

تیسرا —

چوتھا — !!

”وارے میرے پاؤں تلے کوئی چیز دب کر رہ گئی ہے۔“

پہلے ساتھی نے گہرا کر کہا —

”کچھ بھی تو نہیں — فرش ہے جس پر ہم چل رہے ہیں۔“

”وہ دیکھو کیبن کے نچلے حصے سے اس کی شال دکھائی دے رہی ہے۔ سلیٹی رنگ والی شال“

”وہ کیا کہہ رہے ہو؟ سلیٹی شال تو میرے جسم سے چٹی ہوئی ہے۔ کیا تم لوگ اندھے ہو

گئے ہو۔“

وہ کچھ جواب دیے بغیر اسے تنہا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد

ایک نے دوسرے سے پوچھا — ”وہ جو ہمارے ساتھ تھا وہ کہاں گیا۔“

”وہ کون تھا ساتھ ہمارے؟“

”دیکھو کیبن کے نچلے حصے میں اس کی شال بدستور ڈول رہی ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیوں ڈر

لگ رہا ہے۔“

کم و بیش میں بھی“

ایک انجانے خوف اور ڈنڈ میں لپٹے ہوئے وہ کسی طرح کیبن میں داخل ہو گئے۔

”کچھ پیو گے۔“

زندگی اور موت کے بطن سے جنم لینے والی اس آواز کو جیسے انہوں نے سنا ہی نہ ہو۔

”جب پینا نہیں تو جھک مارنے کے لیے بار آئے ہو۔“ جواب نہ ملنے پر وہ غرایا۔

لیکن وہ چپ تھے۔ بالکل گم سم۔

حرام زادو — آج اچانک گونگے کیوں ہو گئے ہو۔ کچھ تو بولو۔ مجھے تو تمہیں وہ

حادثہ سنانا ہے جو اتنا عجیب اور انوکھا ہے کہ میں اس تعلق سے سوچتے ہوئے تقریباً ریزہ ریزہ ہو چکا ہوں۔ مگر میں نے اس شکست و ریخت میں بھی اپنی ذات کے چند پرزے بچا لیے ہیں۔ اور یہ پرزے بھی اب میرے نہیں رہے۔ کل میں اخبار پڑھ رہا تھا اچانک ایک خبر پر میری نظریں جم گئیں۔ ایک نامعلوم تو جوان سلیٹی رنگ کی گرم شال میں لپیٹا ہوا سڑک عبور کر رہا تھا کہ اچانک اس نے سینے میں سخت تکلیف کی شکایت کی اور طبی امداد ملنے سے پہلے ہی مر گیا۔ نعش مردہ خانے میں شناخت کے لیے رکھی گئی ہے۔

میں کل سے اب تک مارا مارا پھر رہا ہوں تاکہ خود اپنی نعش کی شناخت کر سکوں۔

میں اپنے وجود کی کرچیوں کو جمع کرتے کرتے اب لہو لہان ہو چکا ہوں۔

حرمزادو — کیا یہاں میری نعش چبانے آئے ہو۔ میں تمہیں ابھی..... یہ کہہ کر وہ دیوانگی کے عالم میں ان میں سے ایک پر چھپٹ پڑا۔ اب وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کا گلاد بارہا تھا۔

مجھے چھوڑ دو — مجھے چھوڑ دو —

آواز آہستہ آہستہ ڈوبتی گئی مگر وہ بدستور اس کا گلاد باتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ فرش پر ڈھیر ہو کر رہ گیا۔

اب اس کے حلق سے عجیب و غریب آواز نکل رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ چند منٹ کا بہان ہو۔

وہ تھوڑی دیر تک کمر مرنے والے کو دیکھتا رہا۔

پھر اچانک پلٹ کر اس نے دوسرے سے پوچھا۔

وہ یا میری شال کہاں گم ہو گئی۔ !!



بات صرف اتنی تھی کہ ایک بہت بڑے شاعر کی قبر کتبے سے محروم تھی۔ اس سلسلے میں ایک کٹی بنائی گئی اور جب کتبے کی تجویز منظور ہو گئی تو کنویر نے خالی خالی نگاہوں سے مجمع کی طرف دیکھا۔ لوگ آہستہ آہستہ کھسک رہے تھے۔

”کتبے کے لیے پلیسہ چاہیے۔“

”بالکل چاہیئے صاحب! بھلا بغیر پلیسے کے کہیں کتبہ بھی تیار ہوا ہے؟“

”لیکن سوال صلیب بدوش ہونے کا ہے۔“

”بھلے مانس سیدھی زبان میں کیوں بات نہیں کرتے؟“

”وہاں بھائی ہماری زبان خب تک ادق رہے گی، بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔“

بیل پڑھانے کے لیے پانی بھی تو چاہیئے،

”پانی کی ہمارے دس میں کیا کمی ہے؟“

”و آپ کا مطلب سیلاب سے ہے نا؟“

”و ساتھ جو جس مقصد کے لیے ہم جمع ہوئے ہیں وہ پورا ہوتا دکھائی نہیں دیتا،“

”یقیناً پورا ہو گا جی۔ آپ کام تو شروع کر وادیں۔“

”لیکن سوال تو پلیسوں کا ہے۔ افسوس کہ ایک ایسے دوڑیں جب کہ قبریں مٹ رہی ہیں؟“

”تو مٹا کریں۔“

”کیا ایک رہے ہو؟“

”تمہیں یہاں کس نے بلوایا ہے۔؟“

”میں نہیں نفیس آنے کا عادی ہوں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں، اتنے برس کے بعد اچانک کتبہ کا خیال کیوں آیا، پھر ایسی صورت میں جب کہ شاعر نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ اس کی قبر پر کسی قسم کا کتبہ نہ ہو۔“

”شاعر مرنا کب ہے وہ تو مر کر جیتا ہے۔“

”کتبہ یقینی لگے گا؟“

”بالکل بجا۔“

”شاعر کی قبر کہاں ہے؟“

”قبرستان میں۔“

”عجیب بہر ویوں سے سابقہ پڑا ہے۔“

”قبر تو ظاہر ہے قبرستان ہی میں ہوگی۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ قبر کس محلہ کے قبرستان میں واقع ہے!“

”بسٹھی یہ سوال بھی کچھ اہم نہیں۔“

”حیف کیا زمانہ آگیا کہ لوگ مشہور شاعر کے دفن سے واقف نہیں۔“

”اسی لیے تو کتبے کی ضرورت ہے۔“

”اتنی دیر سے بحث ہو رہی ہے کیا شام کی چائے نہیں ملے گی۔؟“

”مزد ملے گی صاحب۔“

”کیا تم نے چاند دیکھا ہے۔؟“

”ہاں بسٹھی دیکھا ہے۔ بالکل الٹا ہو کر رہ گیا ہے۔“

”یہ شگون اچھا نہیں ہے۔“

”مردا یہاں سے کھسک جاؤ۔ یہ بڑے وہی لوگ ہیں۔“

”کیا روزی سے ملاقات ہوئی تھی؟“

”ہوئی تو تھی۔“

”تو پھر کیا کہا اس نے؟“

”دورث شپ کو ابھی لانگ ہونا چاہیئے“
 ”ساتھیو! کتبے کی بات تو ادھوری رہ گئی“
 ”وہ بات جو طے ہو چکی ہے وہ ادھوری کس طرح رہ سکتی ہے؟“
 ”توکل سے کام شروع کروادیں۔ بالکل۔ یقیناً۔“
 ”دور اٹھریئے قبر کی شناخت کون کرے گا۔؟“
 ”وہاں بھی ایہ کتبے سے زیادہ اہم سوال ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی غیر ادیب کی قبر پر ہمارے
 شاعر کا کتبہ چڑھا دیا جائے۔“
 ”ساتھیو یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا“
 ”ہماری محفل میں علامہ برکت بھی تو ہیں۔ وہ ان کے جہن جہنم کے ساتھی تھے“
 ”یا دخالی پیٹ میں چائے زہر کی طرح جھجھ رہی ہے۔“
 ”گھر سے کھا کر کیوں نہیں آئے“
 ”وجہ نہیں چاہا“
 ”اب یہاں سے کہاں چلیں گے۔؟“
 ”فردوس“
 ”وہاں کیا کام ہے؟“
 ”مجھے ایک عربز سے ملنا ہے۔“
 ”کیا میں بھی تمہارے ساتھ چل سکتا ہوں؟“
 ”اگر اس طرح ایک کے پیچھے ایک سب ہی باہر نکل جائیں یہاں کون رہے گا۔؟“
 ”تم اس کی فکر نہ کرو۔ یہاں کافی لوگ ہیں۔ ہر آدمی ہماری طرح تھوڑا ہی ہوتا ہے؟“
 ”آدمی بہر حال آدمی ہوتا ہے۔“
 ”چلو اچھا ہوا ہم انسان ہونے سے بال بال بچ گئے۔“
 ”یہ لوگ تو صرف چائے ہی پر تڑخا رہے ہیں۔“
 ”کیا کھانا بھی تناول فرمانے کا ارادہ ہے۔؟“

”وہ بناؤں سے میں کون صاحب کھڑے ہیں۔“
 ”کوئی بھی ہو یا را! میری چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“
 ”تمہیں چائے کی پٹری ہے۔ مجھے گھم جلد لوٹنا ہے۔ محلے کی فضا خراب ہے۔“
 ”موسم بھی تو خراب ہے۔“

”ساتھیو! میں نے آپ کا بہت وقت لیا خدا کا شکریہ ہے کہ یہ مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو گیا۔“
 دوسرے دن لوگوں نے دیکھا۔ برسوں بعد شاعر کی قبر پھولوں سے لری ہوئی تھی، اطراف میں
 لوہے کی رنگین جالی لگوا دی گئی تھی اور سنگ مرمر کا صاف و شفاف کتبہ سر اونچا کیے کھڑا تھا۔ لیکن
 سب سے عجیب بات یہ تھی کہ شاعر مرحوم کے پہلو میں دفنانے ہوئے ایک آدمی کی قبر سے کتبہ غائب
 تھا۔!

تیسرا کٹ

بچہ کس کا ہے؟ یہ بچہ کس کا ہے؟ بھوم کو پیرتی بیوی ایک بھاری بھر کم آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ اس نے پلٹ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن اس کا چہرہ مدہن سے بالکل خالی تھا۔ بھوم جس تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی تیزی سے گھٹتا بھی جا رہا تھا۔

ایک زمانے کے بعد وہ اپنی بیوی کے ساتھ باہر نکلا تھا تھوڑی سی خوشیاں سمیٹنے کے لیے۔ ان دونوں نے ایک چھوٹا موٹا سا سفر بھی پہنچا۔ مگر گرام بنایا تھا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا، کھانا اور بچہ دیکھنا۔

آدمی جب راستہ طے کرتا ہے تو کبھی کبھار اس کے پاؤں تلے کنکڑ آجاتے ہیں۔ جنھیں ٹھوکر لگا کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔

اس کی بیوی نے کنکھیوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور دل سی دل میں اطمینان کرتی بیوی وہ تدمیوں کی ایک ایک چاپ کو گنتے لگی لیکن وہ اندر ہی اندر جیسے کچھ سوچ رہی تھی۔ کھانا کہاں اور کس ہوٹل میں کھائیں گے۔ اس سے شوہر نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔ ”کسی بھی ہوٹل میں“

بیوی کے اس بے تلی جواب کے بعد اسے آگے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے اطمینان سے سامنے والے دستوران میں داخل ہوا۔

ہوٹل میں کئی کیمین تھے اور بیشتر کیمین خالی خالی سے تھے کیمین سے پرہہ اٹھا کر اس نے رد مال سے کرسیوں کی گرد صاف کی اور اپنی بیوی کے سامنے بیٹورکھ کر ایک سنگریٹ سلگایا۔

”آپ نے ہوٹل کا انتخاب کیا بھی تو....“

”تم ہی نے تو کہا تھا نا کسی بھی رستوران میں کھانا کھالیں گے۔“

”کہا تو تھا مگر گھر سے نکلنے وقت ہمارے ذہن میں کسی اچھے رستوران کا خاکہ تھا۔“

”انسان کی سوچ لا محدود ہے اور خاکے توڑتے ہی رہتے ہیں۔“

”وہ آپ مجھے بوزکر رہے ہیں۔ یہ ہوٹل ہے؟ دیکھئے مینو یہ بھی چائے کے دھبے ہیں؟“

”ہماری طرح کسی دل جلے نے مینو دیکھنے کے بعد اپنی حیثیت کو پہچان کر شاید اس پر چائے

انڈیل دی ہو۔“

بات آگے بڑھنے سے پہلے دیوہیکل ویٹر نے کہیں میں داخل ہو کر ایک دیواری کھڑی کر دی۔

اس کی بیوی نے پھر ایک بار اپنے شوہر کی طرف دیکھا لیکن وہ چپ چاپ بیٹھا تھا جیسے وہ

ویٹر سے خائف ہو گیا ہو۔

اسے تھوڑی دیر پہلے کا ایک واقعہ بے طرح ستا رہا تھا۔ ایک نامعلوم سی غلش ایک بے نام سی

چنگھن اُسے پریشان کیے ہوئے تھی۔ ہوا یوں تھا کہ اس کا ایک دوست جس سے اس نے مدتوں

پہلے کچھ روپے اُدھار لیے تھے جسے وہ عذاب بھولے ہوئے تھا۔ آج اتفاقاً اس کے ہاں آگیا تھا۔

اس کا دوست لمبی چوڑی باتیں کیے جا رہا تھا۔ لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آگے

کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اور اس ایک بات کو اُگھنے کے لیے اُسے سینکڑوں غیر ضروری باتیں کرنی پڑ رہی ہیں۔

جب باتوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اُس نے بجائے رخصت ہونے کے خالی خالی نگاہوں سے اُسے

دیکھا تھا۔

اُس کے دوست سے کہیں زیادہ آج وہ اضطرابی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ

اس کا دوست کچھ کہے مگر وہ کچھ نہیں کہہ رہا تھا۔ پھر تہہ نہیں اس کی زبان پر کا تالا کس طرح کھل

گیا۔ ”مجھے کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔ کل پر سول لوٹا دوں گا،“

وہ اطمینان سے اپنے ساتھی کا محاسبہ کرنے لگا۔ وہ اپنے دوست کا مقروض ہے، شاید

اس لیے وہ اس بھانے پیسے لینا چاہتا ہے۔ وہ صاف صاف بھی تو کہہ سکتا تھا کہ یا تم میرے

مقروض ہو۔ میں نے عین آڑے وقت میں کچھ روپے دیے تھے، اب تم میرے پیسے لوٹا دو۔ تم بھول

گئے ہو۔ لیکن میں نے اسے نہیں بھلایا ہے۔

”پیسے لینے والا اکثر بھول جاتا ہے لیکن جس آدمی کی جیب سے پیسے نکلے ہیں وہ اس منظر کو بھی نہیں بھول سکتا۔“

وہ اس طرح کی ساری باتیں اپنے دوست کی زبان سے سنتا چاہتا تھا، مگر معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ اُس نے اپنا مدعا دوبارہ دہرایا بھی نہ تھا۔

”یاد رکھو عجیب کڑا کی ہے یقین جانو میرے بال صرف سوارو پیہ ہے۔ کل پر سوں تک تو تمہارے بال بھی کچھ روپے آہی جائیں گے۔ مناسب سمجھو تو ایک روپیہ ہی دکھ لو۔“

شاید اُسے یہ تجویز پسند نہیں آئی۔ اس لیے اس بدقت تمام کہا ”ایک روپیہ لے کر میں کیا کروں گا۔ رہنے دو شاید یہ پیسے تمہارے کسی کام آجائیں۔“

”وہ کام تو میرے بھی نہیں آئیں گے۔“

”تو پھر وہ روپیہ ہی لا دو۔“

دفعتاً گھر کی سے ایک سایہ اکھرا اور وہ اندر چلا گیا۔ دو منٹ بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہاتھ میں ایک روپیہ بھی نہیں تھا اور وہ گھٹکھٹاتے ہوئے اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔

اس روپے کو شاید جیب سے میری بیوی نے نکال لیا ہے۔ نہیں نہیں میں بھول رہا ہوں۔ گھر آتے ہی وہ روپیہ میں نے اُسے دے دیا تھا شاید خرچ میں آگیا ہو۔

”عجیب کرب بے چارگی، انشاء سے گورو ہے میں ہم لوگ اور گنوار پن کا۔ عالم ہے کہ چھوٹ بھی سلیقے سے نہیں کہہ سکتے۔ یہ کہہ کر وہ جیسے اس کے منہ پر طمانچہ مار کر چلا گیا۔

”وہ کیا سوچ رہے ہیں آپ، چائے ٹھنڈی ہو چکی ہے“

جیسے وہ خواب سے چونکا۔ ”مگر وہ کھانا“

”کھانا دانا میں نے نہیں منگوایا۔“

”کیوں؟“

”بس یونہی“

کوئی دوسرا ہوش دیکھیں“

”دوسرا بھی ایسا ہی ہوگا۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔“

”اب رہنے بھی دیکھئے۔“

ہوٹل کے سارے کین لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ صحن میں چند لوگ یا تو چائے کی چمکیاں لے رہے تھے یا سنبو سے کھا رہے تھے۔ کچھ لوگ آج کے مسائل پر فاضلانہ انداز میں باتیں کیے جا رہے تھے۔ تیسری جنگ چھڑ گئی تو کیا ہو گا؟

”وصاف مرجائیں گے۔“

”تو کیا اب جی رہے ہیں؟“

”جی تو رہے ہیں اور ساتھ ساتھ سنبو سے بھی کھا رہے ہیں آئے تو کچھ اور ہی ارادے سے۔“

”سب لوگ ہنسے لگے۔“

اس کی بیوی نے اپنے شوہر کو کھویا کھویا سا دیکھ کر طنز بھرے انداز میں کہا۔ آپ کا ساڈل آدمی میں نے شاید ہی دیکھا ہو، دیکھو! لوگ باتیں بھی کر رہے ہیں اور ہنس بھی رہے ہیں، اور آپ ہیں کہ بت بنے بیٹھے ہیں۔“

اُس نے اپنی بیوی کے اس طنز کا کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کھڑا ہوا اب وہ دونوں تیز تیز قدم ڈالتے، پروگرام کے مطابق سینما ہاؤس جا رہے تھے۔ شام کے ڈھلنے ہی بڑے بازار کی رونق میں اضافہ ہو گیا تھا۔ نئے نئے موڈل کی موٹر میں تیزی سے سڑک کے سینے پر دوڑ رہی تھیں اور لوگ یاگ مختلف دوکانوں میں گھسے ہوئے شاپنگ کر رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو حسرت سے دوکانوں کے چمکتے ہوئے شیشوں میں اپنے عکس ہی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور بعض سٹی سجاٹی دوکانوں کی مختلف چیزوں کو الٹ پلٹ کر یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ یہاں واقعی کچھ خریدنے کے خیال سے آئے ہوں۔

سینما ہاؤس ابھی کافی دور تھا اور ہیزس اسٹاپ پر ایک لمبا سا کیو لگا ہوا تھا۔ کیو کی الجھن سے بچنے کے لیے وہ پیدل ہی جا رہے تھے۔ وہ چاہتے تو ٹیکسی بھی لے سکتے تھے۔ لیکن پتہ نہیں ان دونوں کو پیدل چلنے میں کس قسم کی لذت کا احساس ہو رہا تھا۔

لیکن ٹری سڑک پار کرنے کے بعد اس کی بیوی کی چال میں تھکن پیدا ہو گئی تھی۔

”کیا ٹیکسی لے لیں“

”اتنی دور چلنے کے بعد اب آپ کو ٹیکسی کا خیال آیا۔ یہ بات تو آپ کو پہلے ہی کہنی چاہیے تھی۔“

”میں اب تک ہی سمجھتا رہا کہ تم پیدل چلنے کے موڈ میں ہو۔“

”آپ کی شخصیت ہی کچھ عجیب سی ہے۔ وہ بات جو کسی کے ذہن میں نہیں آتی یہ نہیں کس طرح

آپ کے ذہن میں آجاتی ہے؟

”وہی تو میری انفرادیت ہے۔“

”خاک انفرادیت۔“

وہ اس آجیلے کو جیسے پی گیا

اب وہ دونوں پھر چپ چاپ۔ سڑک سے گزر رہے تھے۔ مجھے معاف کر دیجئے کبھی کبھی مجھ سے

گستاخی ہو جاتی ہے اور آپ بھی چپ چاپ میری باتوں کو پی جاتے ہیں۔ آپ مجھے غلطی پر ٹوکتے بھی تو نہیں۔

اب وہ سینما کے احاطے میں داخل ہو چکے تھے۔ وہ پکچر جس کے ارادے سے وہ یہاں آئے تھے

وہ کل ہی جا چکی تھی اور اس کی جگہ ایک دوسری نئی فلم کا بورڈ سینما کے گیٹ پر لٹکا ہوا تھا۔ پکچر غالباً

ابھی ابھی شروع ہوئی تھی۔ اُس کی بیوی نے بکنگ وڈز کے قریب پہنچ کر فرسٹ کلاس کے تین ٹکٹ

خریدے۔

”یہ دو کے بجائے تم نے تین ٹکٹ کیوں خریدے؟“ اس کے شوہر نے حیرانی سے پوچھا۔

یہ تیسرا ٹکٹ میں نے مٹے کے لیے لیا ہے، جو کبھی ہمارے ساتھ یکدم دیکھا کرتا تھا۔ کم از کم بہتر

یہ احساس تو رہے کہ وہ آج بھی ہماری چھوٹی سی چھوٹی خوشی میں شامل ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے

اپنے شوہر کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں کی خلاؤں میں عجیب سی گواہی تیر رہی تھی۔

دوگزین

صبح ہی صبح بستر سے اٹھ کر اس نے مندی مندی آنکھوں سے اپنے کمرے کا جائزہ لیا۔
 ڈراڈ نے خواب کے ریزے اس کی آنکھوں کے حلقے پر ابھی تک نیزے کی طرح دھنسے ہوئے تھے۔
 اچانک اس کی نگاہ سامنے کھڑی ہوئی چوبی الماری سے لگے اس پرانے شیشے پر گئی۔
 جہاں ایک بھیانک سایہ اس کا منہ پڑا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سفید کبوتر کے پروں کا ایک
 گھونسل لٹک رہا تھا۔ اور ہونٹوں سے ذرا اوپر کالی موچھوں کا ایک لچھا نہیں۔ اس
 کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ گھر کی بیمار اور کمان کی طرح جھکی ہوئی دیواریں جیسے کانپ
 کانپ گئیں۔ اور سامنے درخت کی جھولتی ہوئی شاخوں پر بیٹھے ہوئے پرندے ہلکے آکر
 آسمان کی پتھائیوں میں ڈوب گئے۔

اس کی بیوی وحشت کا لبادہ اوڑھے، حیرت سے اس طرح اُسے دیکھ رہی تھی جیسے
 وہ اس کا شوہر نہیں کوئی اور آدمی ہو۔
 وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا برآمدے میں آیا اور آپ ہی آپ بڑبڑاتا ہوا کیا رنگی گھر سے
 نکل پڑا۔

اب وہ آدمی زمین کا یہ ٹکڑا تمہیں کسی قیمت پر نہیں دے گا۔ بیوی کی تمہہ تھراتی ہوئی آواز
 بھی اب اسے بھاری تیجھ کی طرح ضرب لگاتی ہوئی محسوس ہوئی اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔
 تیس برس کی طویل مسافت ————— طیر بھی میٹر بھی بے دھتگی سڑکیں — بھاگ دوڑ چیخ و پکار
 ————— گھٹن بے چاہی۔

کیا تم سمجھتے ہو وہ آدمی زمین کا یہ ٹکڑا تمہیں دے دے گا۔ اب تو اس کی قیمت بھی آسمان

کو چھو رہی ہے۔“ یہ اس کی بیوی کی آواز تھی جو اس کا مسلسل تعاقب کر رہی تھی۔

اچانک اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اب وہ یادوں کی عمیق کھائی میں اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔ سویرے کا ملگجا اجالا سڑک پر پھیلے ہوئے مکافوں کی چھتوں پر آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ اور اسے بہت دور جانا تھا۔ میلوں دور شہر کی ساری دکائیں سوئی ہوئی تھیں۔ اور ان کے منہ میں دھنسے ہوئے کالے بے ڈھنگے سے تالے ایک عجیب طرح کی ویرانی کا احساس دل رہے تھے۔ ٹیکسی اسٹانڈ پر موت کا سا سکوت تھا اور ڈرائیور حلقہ بنا کر چپ چاپ کھڑے تھے۔ ٹیکسی۔۔۔ اس نے آواز دی۔ اور ٹیکسی کی آواز کے ساتھ ہی سامنے کھڑے ہوئے ڈرائیوروں میں سے کسی منچلے نے کہا۔ ٹیکسی بات نہیں کرتی اور ڈرائیور کہتا ہے کہ آج ہڑتال ہے

”اور وہ سکوڑ والے۔“

”وہ بھی ہڑتال پر ہیں۔“

”رکٹ والے۔“

”وہ بھی۔۔۔“

اب اس کے لیے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ پیدل چلے۔ اور وہ سڑک پر چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ درمیان میں اسے دو ایک ٹیکسی کاریں سڑک پر دوڑتی ہوئی دکھائی دیں۔ لیکن اس میں ڈرائیور بیٹھے ہوئے تھے۔ مانگیں۔ مکمل اور ادھوری۔ مضبوط اور توانا۔ لاٹھی چارج۔ آنسو گیس۔ گولی۔ دنگا فساد۔ آگ اور پھر پانی۔ بچہ سے اس نے ہی سب کچھ دیکھا تھا۔ راستہ چلتے چلتے وہ ایک عجیب حادثہ سے دوچار ہو گیا۔ وہ جس آدمی سے زمین کے اس ٹکڑے کو خریدنے جا رہا تھا۔ اس کا نام اس کے ذہن سے مٹا بخوبی تھا۔ ذہن پر بار ڈالنے کے باوجود اسے اب اس کا نام یاد نہیں آ رہا تھا اس نے الف سے لے کر ی تک کی گردائیں کر ڈالیں لیکن اس کا نام کسی بھی حرف سے شروع ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

مگر اچانک وہ راستے ہی میں اسے نظر آ گیا۔ اس کے ساتھ دو اور آدمی بھی تھے جو اس کے آگے پیچھے اس طرح چل رہے تھے جیسے وہ اس کے باڈی گارڈ ہوں۔

اس کا جی چاہا کہ اسے پکارے۔ مگر کس نام سے۔ وہ کوفت اور غصے سے آپ ہی آپ بلبلاتا تھا۔ لیکن اس آدمی نے چلتے چلتے اچانک پلٹ کر اسے دیکھ ہی لیا۔ اور اس کے ساتھ والے دونوں آدمی بھی اس کے تیغ میں وہیں اس کے برابر ہی ٹھہر گئے۔

”اے تم۔ صبح ہی صبح کدھر نکل گئے۔“

”تمہارے ہی ہاں جا رہا تھا۔“

”کہو کوئی خاص بات۔“

”وہ زمین.....“

”وہ اب تمہیں نہیں ملے گی۔“

آخر کیوں۔؟

تم نے بہت دیر کر دی۔ اس کا وقت گزر چکا۔

مگر تم نے تو وعدہ کیا تھا۔“

”وعدہ۔۔۔؟ اگر ہر آدمی وعدہ جیسے بے معنی لفظ کا پاس رکھے تو اس پر کیا گتی ہوئی دنیا کا کوئی اور نام رکھنا ہو گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اس کے ساتھ والے دونوں آدمیوں نے جاتے جاتے اسے اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ سُن لیا ہے نا جواب۔

وہ اس کے اس ظالمانہ برتاؤ سے گھٹل کر رہ گیا۔ اس کا سر ٹکرا رہا تھا۔ زمین کے ٹکڑے کا وہ لالچ آخر اس نے اسے دیا ہی کیوں تھا۔ بدعاش۔ کینہ۔ سفاک۔ اب راستہ چلتے ہوئے اسے احساس ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی متاعِ عربیہ کو کہیں دور دفن کر آیا ہو۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا۔ سڑک سے لگے قبرستان سے اچانک ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اور آگے چل کر جس آواز چھٹی چلی آوازوں میں تبدیل ہو گئی۔ اسحاق دماکدالی زور سے چلانا یار۔ دیکھ نہیں رہا ہے لاشِ زمین پر کب سے ہمارے دم و کرم پر پڑی ہوئی ہے۔ اسے جلدی زمین کے منہ میں ٹھونس دے۔“ لعش بھاری ہیں ہے۔ یہ ٹکڑا ہی اس کے لیے کافی ہے۔ اس نے پیشانی پر آئے ہوئے پسینے کے قطرے

کو اپنی قمیض سے پونچھتے ہوئے کہا۔

”دیکھ کوئی قبرستان ہیں داخل ہو رہا ہے۔ کون ہو گا وہ۔“

”کوئی بھی ہو گا سالہا۔ اپنے کو اس سے کیا لینا دینا۔“

”مگر وہ تو اسی طرف آ رہا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اخبار کا رپورٹر ہو۔“

”یہ نیش کس کی ہے۔؟“

”تمہیں اس سے کیا۔“

”کیا نام تمہارے والے کا۔“

نیش کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ نیش بے نام ہوتی ہے۔ نام زندگی ہی تک چلتا ہے جب سانس اکھڑ جاتی ہے تو سانس کے ساتھ ہی نام بھی دفن ہو جاتا ہے اور نیش لاوارث ہو جاتی ہے۔“

”مگر نیش پر تو کفن بھی لپٹا ہوا نہیں ہے۔ یہ نیش کی بے حرمتی ہے۔“

”ہم نے جتنی بھی آج تک نعشیں دفن کی ہیں۔ وہ بے کفن ہی تھیں۔“

”بڑے موڈرن گورنر معلوم ہوتے ہو۔“ اس کے لمبے ہیں طنز تھا۔

”مگر یہ سب کچھ تو اوپر والے ہی حکم سے ہوتا ہے، ہم تو سب تابعِ ارباب ہیں۔“

”وہ کیا رنگی قبرستان سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ اُسے یہ دیکھ کر سخت حیرانی ہوئی کہ اس

کے سامنے سے اب جو بھی لوگ گزر رہے تھے ان کے چہروں پر سفید پروں والے کبوتروں

کے گھونسلے لٹکے ہوئے تھے اور ہونٹوں سے ذرا پرے کالی اور سیاہ مونچھوں کے کئی لچھے۔

اس کے حلق سے ایک بھیا نک پیچ نکل گئی۔ اور دھتوں کی جھولتی ہوئی شاخوں پر

بیٹھے ہوئے پرندے پھر ایک بار آسمان کی پہنائیوں میں ڈوب ڈوب گئے۔

کنوال آدمی اور سمندر

میں نے دروازے کی کٹڑی لگائی تالا گھمانے کی کوشش کی تو لگا جیسے تالے میں کوئی اچانک خرابی پیدا ہو گئی ہو۔ غور کیا تو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ میں نے جو چابی استعمال کی ہے وہ دراصل دوسرے تالے کی سا جیسے دار ہے۔ اس کا اس تالے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں نے لوٹتے قدموں سے اندر جا کر دیکھا۔ چابی میز پر دھری تھی۔ اس بار تالے میں چابی گھمائی تو ایک لمحہ بعد ہی تالے کا منہ بند ہو گیا۔ اور میں سیڑھیاں بھلا نکلتا ہوا نیچے آ گیا۔

سڑک پر کافی گہما گہمی تھی، گوا بھی شام ہونے میں دیر تھی لیکن بعض منچلے دکانداروں نے مرکبوری ٹیوب کے علاوہ طرح طرح کی خوبصورت لائٹس جلا رکھی تھیں اس کے باوجود ان دکانوں میں خال خال ہی گاہک تھے۔ البتہ ریڈی میڈ کارمنٹس کی دکانوں میں لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔

کاریں پارک لائن میں آدھی ترچھی قطار میں بنائے کھڑی تھیں کچھ ڈرائیور تازہ ہوا کھانے کے لیے اپنی اپنی کاروں کے باہریوں کھڑے تھے جیسے وہ ڈرائیور نہ ہوں مالک ہوں۔ قریبی ہی کیمسٹ کی ایک دکان بھی جہاں اشرف کھڑا بوڑھے کیمسٹ سے مسلسل باتیں کیے جب رہا تھا۔

”اوے اشرف تم یہاں؟“

”ہاں یہ بہرام دارو والا میرا رہا ہے۔ یہ دکان اسی کی ہے۔ آؤ باہر چلی کر باتیں کریں۔“

”نہیں یاد ہے نا۔ ہماری آخری ملاقات میٹرو میں ہوئی تھی۔ شاید یہی کوئی دوسرا بل۔“

”ہاں یاد ہے جُنید۔ یہ بھی یاد ہے کہ میرے منہ کرنے کے باوجود تم نے سارا بل

ادا کر دیا تھا۔

”کیا چھوٹی چھوٹی باتوں کو یاد رکھتے ہو یاد۔ پہلے یہ بتاؤ کیا تم نے سارنگ پور ہمیشہ ہمیشہ سے لیے چھوڑ دیا۔“

ایسا تو نہیں مگر بمبئی کی مہانگری میں ٹامک ٹو بیسے ضرور مار رہا ہوں۔
اشرف تم نے سارنگ پور چھوڑ کر بڑی غلطی کی۔ ایک تو خاصی بھلی نوکری جاتی رہی۔
دوسرے وہاں تمہیں قدم قدم تکلیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا۔
تکلیف کہاں نہیں ہے۔ ہر جگہ ہے۔

کم از کم تم اپنی والدہ کی خاطر بمبئی چھوڑ کر سارنگ پور آ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔
والدہ کی خاطر۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ وہ میرے جانے کے بعد ہی اچانک چل بسیں
اب مجھے پرسہ نہ دو۔ مجھے ہمدردی جتانے والوں سے ایک گھن سی آتی ہے۔ تم میرے ایک
اچھے دوست ہو۔ یقین ہے تم میری اس بات کا برا نہیں مانو گے۔ جلد کہیں یاد ہے۔ میرا
ایک چھوٹا بھائی بھی تھا۔

آج کل وہ دوبئی میں ہے۔ اس کہنے نے میں یک لخت بھلا دیا۔ میں نے اُسے ماں کی
عکالت کی خبر دی تو یہ ہے اس نے کیا کہا۔
بیماری بوڑھوں کا مقدر ہے۔“

پھر جب میں نے ماں کی موت کا اسے ٹیلی گرام بھیجا تو اس نے دو سطر ہی میں مجھے ٹرٹا
دیا۔ موت برحق ہے۔ ویسے میں نے یہاں فاتحہ خوانی کا انتظام کر وادیا ہے۔ براہ کرم
خط کو محبت کا پیمانہ نہ بناؤ۔ میں یہاں ہمیشہ مصروف رہتا ہوں۔“

اس کے بعد نہ میں نے اسے خط لکھا اور نہ اس نے۔ اب میں نے اس کہنے کو بالکل
ہی بھلا دیا ہے۔ یہ ایک لمبی داستان ہے سن کر کیا کرو گے۔ سوچ رہا ہوں ریڈی میڈ
سگار منٹس کی ایک چھوٹی سی دکان کھول لوں۔ بھنڈی بازار میں ایک جگہ بھی دیکھ لی ہے۔
ورنہ قحط پاتھ تو ہے ہی۔ اُس دلیل نے اگر چاہا ہوتا تو میں یہاں یوں دھکے نہ کھاتا۔
خیر اللہ بڑا کارساز ہے۔ کچھ نہ کچھ سبیل نکل ہی آئے گی۔ اب سناؤ تمہارا کیا حال ہے کیا

اب بھی وہی امپورٹ اور ایکسپورٹ والا چکر۔“

ہاں اس کے علاوہ کوئی راستہ بھی تو نہیں۔“

ہزاروں ہزار تو ماہانہ کسی طرح مل ہی جاتے ہوں گے۔“

ہاں گزر رہی جاتی ہے۔ میں نے گول مٹول سا جواب دیا۔ حالانکہ میری ماہانہ آمدنی پانچ چھ ہزار سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

آؤ سامنے والا ہوٹل کچھ سونا سونا سا لگ رہا ہے۔ سکون اور گپ بازی کے لیے یہ جگہ مناسب ہے ہوٹل پہنچتے ہی بوڑھے بیرے نے اسے اس طرح سلام کیا جیسے وہ بے تاج کا بادشاہ ہو۔ کافی یا چائے۔ یا کچھ اور۔ بیرے نے مودبانہ انداز میں کہا۔

دونوں گرو قہہ و قہہ سے۔ یہ میرا یاد جنید ہے نا۔ ایک زمانہ بعد مجھے ملا ہے۔ اگر اس نے بل PAY کرنے کی کوشش کی تو تم ہرگز نہ لینا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

بھلا میں آپ کی بات ٹال سکتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد مجھے بوڑھا بیرہ ٹرے میں کافی کے دو پیالے ہاتھ میں تھا میں قریب آتا دکھائی دیا۔ جنید دیکھا یہاں کی سروس۔ اگر کسی بیڑھیار لیستورال میں گئے ہوتے تو یونیورسٹی دیکھتے ہی میں آدھا گھنٹہ بیت جاتا۔ اور آڈر کی تکمیل تک کم و بیش دو گھنٹے کبھی کبھی تو بڑھا یا بھی دستک دے جاتا ہے۔“

”بڑی عمر ہو چاہے ہے اشرف۔ تم نے اچھے ہوٹل کا انتخاب کیا۔“

”چلو چائے تو تمہیں پسند آگئی۔ اب جب کافی آئے تو اس کا بھی مزہ چکھ لینا۔“

نہیں یاد مجھے کافی بالکل پسند نہیں۔ جب کبھی میں نے اسے حلق میں اتارنے کی کوشش کی۔

مجھے محسوس ہوا جیسے سارے زمانے کی تلخیاں میرے گلے میں تیزاب بھر رہی ہوں۔“

”تو پھر آؤ گنیل کر وادیتے ہیں۔“

”نہیں ہیں۔ میں اگر نہ بیوی تو اس کا یہ مطلب ہیں کہ تم بھی نہ بیو۔“

”نہیں آج تمہارا ساتھ دینے میں ہی میری عافیت ہے۔“

”تو ٹھیک ہے دو چائے اور منگوائیں گے اور کچھ بسکٹ بھی۔“
 بسکٹ میں کیا دھرا ہے۔ کوئی سادہ سا کھانا ہی منگائیں۔ یاد و پلیٹ بریانی۔ یہ ہوں
 بریانی کے لیے بھی اپنا ایک خاص معیار رکھتا ہے۔ مگر میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ ویسے سات
 بج چکے ہیں۔ رات میں جلد کھانے سے نیند بھی اچھی آتی ہے۔ میری اس پکڑ بازی سے کہیں تم
 بور تو نہیں ہو رہے ہو۔

بور ہونے کی بھی خوب رسی۔ تم جو چاہو یہاں سے منگوا سکتے ہو۔“
 پھر میز پر ایک ایک کمرے وقفے وقفے سے وہ سب چیزیں آگئیں۔
 اب وہ تیزی سے کھانے لگا۔ جیسے اُسے کوئی اہم ایانٹمنٹ یاد آگیا ہو۔
 میں نے اس سے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور اس نے نتیجے میں میرا بھی ہاتھ تیزی سے
 چلنے لگا۔ جتنی اس نے یہاں کی بریانی کی تعریف کی تھی۔ گو وہ ویسی نہ ہوتے ہوئے بھی کچھ بُری
 بھی نہ تھی۔ میرے نے جوں ہی میز پر بل رکھا۔ میں نے اچک کر اسے ہاتھ میں تھام لیا۔ صرف
 چالیس روپے؟

”وہ نہیں تیس ہی روپے ہونا چاہیے۔ شاید ان لوگوں نے کچھ دام بڑھا دیے ہوں۔ مگر
 یہ بل تم کسی صورت بھی PAY نہیں کر سکتے۔ کیوں بوڑھے میرے کو میرے ہاتھوں مردانا
 چاہتے ہو۔“

میں نے دیکھا اب وہ اپنی جیبیں تلاش کر رہا تھا۔
 کہے دیتا ہوں یار۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ تم یہ بل مجھے دے دو۔“
 لیکن میری مٹھی میں کاغذ کا وہ پرزہ بند تھا۔ میں نے ٹپ (TIP) کی شکل میں پانچ کا ایک
 نوٹ بھی شامل کر دیا تھا۔

آخر تم ہی نے یہ بازی جیت لی جنید۔ یہ تجربات تمہارے علاوہ کسی اور نے کی ہوتی تو میں
 اس کا داغ سیدھا کر دیا ہوتا۔ اچھا اب اجازت دو۔ ہو سکے تو بمبئی جانے سے پہلے فرود
 ٹوں گا۔ یہ ملاقات کل بھی ہو سکتی ہے اور ہفتے بعد بھی۔

وہ جب چلا گیا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ لیکن میرے اس سکون میں بھی ایک

عجیب طرح کا اضطراب تھا۔ کیا وہ بل اسے دینا چاہیے تھا یا مجھے۔ بیرے نے یہ بل اس کے سامنے رکھنے کی بجائے میرے قریب کیوں دکھا۔ کیا بیرے کو اس نے پہلے ہی سے یہ ہدایت دے رکھی تھی۔ تو یہ تو یہ۔۔۔ ان چھوٹی چھوٹی غیر ذمہ باتوں نے آج مجھے کیوں اسیر کر رکھا ہے۔

بھلا چالیس روپے کا بل بھی کوئی بل ہے؟ جب کہ میں جیسے تیسے ماہانہ پانچ ہزار کمالیتا ہوں۔ ابھی تو وہاں اس کے پیر بھی نہیں جھے ہیں۔ وہیں کے اقربا جاگمگم ہونے والے ان سارے طیرے میڑھے خیالات کو رو دیتا ہوا میں آگے بڑھ گیا۔

اب میں اپنے آپ کو بڑا ہلکا پھلکا سا محسوس کر رہا تھا۔ مگر رخصت ہونے سے پہلے جو اس نے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا عجب کہ اس کی تہہ میں کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہو۔ جنیں نہیں وہ تو اس وقت شرمندگی کے بوجھ تلے دب سا گیا تھا۔

دو چار برس یونہی پر لگائے اور گئے تو میرے ذہن کی سلیٹ سے بھی اس کا نام تقریباً مٹ چکا۔ اور میں حسب معمول اپنے پھیلتے سکوڑتے کاموں میں لگا رہا۔

پھر اچانک ایک دن سارا رنگ پور کی بڑی چھاؤنی کے راستے پر وہ مجھ سے ٹکرا گیا۔ یہ حادثہ بھی میری نادانی سے ہوا۔ اس کی حالت بڑی خستہ تھی۔ لگتا تھا جیسے ناگہانی آفتوں نے اس کی صحت کا کچھ مر نکال دیا ہو۔ وقتی طور پر ہمدردی کی ایک لہر دل میں جاگ اٹھی۔ لیکن ہمدردی کے اس جذبے کا میں نے فوراً ہی گلا گھونٹ دیا۔

کیا تم پھر سارا رنگ پور آگئے۔؟

تم تو یہی چاہتے تھے نا۔ اس کے لہجے میں بھی تلخی تھی۔

لیکن اس حال میں نہیں۔۔۔

تو پھر کس حال میں۔۔۔

یہ بھی کوئی پوچھنے یا بتانے کی کوئی بات ہے۔

تمہیں میری فکر کرنے کی چندال ضرورت نہیں۔ تم خواہ مجھ سے ٹکرا گئے۔ بڑی چھاؤنی کے راستے میں ایک اندھا کنواں بھی پڑتا ہے۔ ذرا سنبھل کر جانا۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ اندھا کنواں۔۔۔؟ یہاں تو میں نے آج تک کوئی اندھا کنواں نہیں دیکھا۔ تو پھر اس

نے مجھ سے اندھے کنویں کی بات کیوں کی۔ میں ایک لمحے کے لیے گڑبڑا سا گیا۔ پھر راستہ چلتے چلتے میں نے قریب جاتے ہوئے واپس پوچھا۔ کبھی یہاں کوئی اندھا کنواں بھی ہے۔؟
اندھا کنواں۔؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔

نہیں نہیں کچھ نہیں۔ بس یونہی پوچھ لیا۔
کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ خود ہماری زندگی ایک اندھا کنواں ہو۔؟
یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ آج لوگوں نے اپنی اپنی آنکھوں پر ٹپیاں باندھ رکھی ہیں۔
میں اس وقت جلدی میں ہوں۔ ممکن ہے سارنگ پور کے تاریخ کے اوراق میں اسی اندھے کنویں کا کہیں نہ کہیں کوئی ذکر ہو۔

اس طرح کئی برس بیت گئے۔ نہ مجھے اندھا کنواں ہی دکھائی دیا اور نہ اشرف۔
لیکن ایک دن دفعتاً میں نے ایک مقامی اخبار میں ایک اشتہار دیکھا۔
» دنیا کی پہلی اور آخری تجرباتی فلم "اندھا کنواں" جو کل سے بیک وقت دو تھیٹروں میں ریلیز ہو رہی ہے۔ رنگ محل اور داستان میں۔

اس اشتہار کو پڑھ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اور میں آنے والے کل کا ابھی سے انتظار کرنے لگا۔ اور وہ کل بھی آگیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ شام سے پہلے ہی میں نے رنگ محل کا رخ کیا۔

فلم شروع ہونے میں ابھی چند ہی منٹ باقی تھے۔ لیکن دور دور تک کہیں بھی لوگ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تھیٹر بھر چکا ہو۔ اور کوئی بھی سیٹ خالی نہ ہو۔ لیکن باؤڈ فل کا بورڈ تو لگا رہنا چاہیے۔ میں ایک لمحے کے لیے ڈگسا گیا۔ دفعتاً میری نگاہ بکنگ ونڈ وپر گئی جہاں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کھڑکی کے سوراخ سے یوں جھانک رہا تھا جیسے وہ کسی ذہنی عذاب میں مبتلا ہو۔

میں نے پانچ کا ٹوٹ تھماتے ہوئے اس سے پوچھا۔ کیا پیکر شروع ہو گئی۔؟

بس اب شروع ہونے کو ہے۔

مگر ٹکٹ پر سلیٹ نمبر درج نہیں ہے۔

کوئی بات نہیں ہے صاحب۔ آپ جہاں اور جس جگہ چاہیں بیٹھ سکتے ہیں۔ پورا ہال
 ابھی اس نے اپنا جملہ پورا کیا ہی نہ تھا کہ میں تیزی سے سینا ہال میں داخل ہو گیا۔ فلم ابھی ابھی
 شروع ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا سینا ہال کی مدہم روشنی میں، میرے علاوہ صرف ایک آدمی تھا جس
 کی آنکھیں ایک عجیب و غریب سیاہ چشمے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ یکبارگی مجھے لگا وہ اپنی شخصیت
 کے بہرین مو کو مجھ سے چھپانا چاہتا ہو۔

پھر جب یکچرخ ختم ہوئی وہ آدمی سینا ہال سے نکل کر دھیرے دھیرے چلنے لگا۔ جیسے وہ
 اپنے ہی قدموں کی مدہم چاپ سے گھبرا رہا ہو۔ یا اسے اس بات کا ڈر ہو کہ کہیں کوئی اچانک
 اس سے ٹکرا نہ جائے۔

مجھے شبہ سا ہوا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ کہاں۔؟ کچھ بھی تو یاد نہیں۔
 دنیا کی پہلی اور آخری تجرباتی فلم جو ابھی ابھی میں نے دیکھی تھی اس کا تاثر ہولے ہولے
 میرے ممکن پر ضربیں لگا رہا تھا۔

مگر کیا۔ کچھ لوگ آنکھوں پر سیاہ ٹیٹاں باندھے اس کی طرف کیوں بڑھ رہے ہیں۔
 کہیں ایسا تو نہیں کہ اندھے کنویں کے سحر نے ان کے پاؤں میں پھر ایک بار بیڑیاں ڈال دی
 ہیں۔